بے جڑ کا درخت

سیّد ولی اللہ

بے جڑ کا درخت

سید ولی اللہ

مشعل

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

دیباچہ

ناول ''بے جڑ کا درخت'' کے مصنف سید ولی اللہ بنگلہ زبان کے مشہور تخلیق کار ہیں۔ برصغیر کی آزادی کے بعد بنگال نے جو بڑے افسانہ اور ناول نگار پیدا کئے۔ ان میں سید ولی اللہ بہت اہم ہیں۔

ان کے فن کی نشو ونما اس دور میں ہوئی جب ٹیگور اور سرت چٹرجی دونوں کا انتقال ہو چکا تھا اور وقتی طور پر بنگلہ ادب، خصوصاً افسانوی ادب میں انحطاط کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ لیکن بنگال کے قحط، آزادی کی جدوجہد اور ترقی پسند قوتوں کے ابھرنے کی وجہ سے صورت حال تیزی سے بدلی۔

جن بنگالی ادیبوں نے سید ولی اللہ کو متاثر کیا ان میں پربھات کمار مکرجی، بدھا دیو بوس، پریندرا مترا اور سالک بندوپادھیا نے جیسے عظیم ادیب شامل ہیں لیکن جس ادیب نے ولی اللہ کے فن پر سب سے گہرا اثر کیا وہ یقیناً سرت چٹرجی تھی۔ اپنی انسان دوستی اور دیہی علاقوں کی عمدہ عکاسی کے لئے سرت کا بنگلہ ادب میں وہی مقام ہے جو اردو میں منشی پریم چند کا ہے۔

بہرحال ولی اللہ نے رفتہ رفتہ اپنے لئے ایک منفرد راہ ڈھونڈ نکالی۔ انہوں نے اپنی کہانیوں کے لئے برصغیر کا جو حصہ چنا وہ آج کا بنگلہ دیش ہے۔ اس حصے سے وہ بخوبی واقف تھے اور یہاں کی دیہی زندگی کے بارے میں ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور وسیع ہے جب وہ یہاں کے غریب عوام کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں تو جذبات اور تخیلی عناصر کی بجائے حقیقت نگاری کا سہارا لیتے ہیں اور یہ حقیقت نگاری بہت پُر اثر ہے۔

پچھلی نصف صدی میں افسانے اور ناول نگاری کا معیار برصغیر کے ادب میں خاصا بلند رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں شاہکار افسانوں اور ناولوں کی تعداد اُردو سے زیادہ

بنگلہ ادب میں ملتی ہے۔ بنگالی افسانوں اور ناولوں کا بغور مطالعہ کریں تو بہت سے پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ایسے پہلو اور ایسی خصوصیات جو انہیں برصغیر کی دوسری زبانوں میں میں لکھے جانے والے ادب سے ممیّز کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے اکثر ادیبوں کو کہانی سنانے کا ڈھنگ آتا ہے۔ آج بھی ان کے یہاں پلاٹ کو اہمیت حاصل ہے۔ میں ان کے فن کے اس پہلو کو اہمیت دیتا ہوں کیونکہ میری رائے میں بغیر مناسب پلاٹ کے نہ افسانہ، افسانہ رہتا ہے اور نہ ناول، ناول۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بنگالی ادیبوں کے یہاں علامتوں کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ آسان علامتیں اور استعارات ان کے یہاں بھی ملتے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے اپنی نجات کے لئے کیسے کیسے امتحانوں سے، کیسے کیسے دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مسلم بنگال کے کینوس پر لکھے گئے ادب میں ہمیں بہت سی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ دیہات کے مسلمان سادہ لوح بھی ہیں، ساتھ ہی کم علم اور غریب بھی، اس لئے ان پر ہر دور میں فقیروں، پیروں اور علما نے دین کا اثر رہا ہے۔ مزاروں اور خانقاہوں سے عموماً انہیں بڑی عقیدت ہوتی ہے اور ان کی اکثریت کو یہ یقین ہوتا ہے کہ ان مزاروں میں دفن بزرگوں کی وساطت سے ان کی دعائیں خدا تک آسانی سے پہنچ سکتی ہیں۔ میں یہاں مسلم بنگال کے چند بڑے شہروں کے مسلمانوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان لاکھوں مسلمانوں کا جو ہزاروں دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں صدیوں سے آباد ہیں اور صدیوں ہی سے ایک ہی طرح کے اعتقادات اور پیچیدہ معاشی اور سماجی مسائل کے زیر اثر ہیں۔

اپنے دوسرے ہم عصر معروف بنگالی ادیبوں مثلاً شوکت عثمان اور منیر چودہری وغیرہ میں سید ولی اللہ مجھے اس لئے منفرد نظر آتے ہیں کیونکہ ان دانشوروں کے برعکس ان کے یہاں اندازِ بیان میں بھی اور موضوعاتی اعتبار سے بھی بڑا دھیما پن ہے۔ ان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ وہ اپنی اکثر تحریروں میں سادہ بیانی اور بیانیہ طرزِ تحریر کو ترجیح دیتے ہیں۔ انسانی زندگی کے مختلف معاشی، معاشرتی اور جذباتی مسائل اور فطرت کی پیچیدگیوں کی ان کے یہاں بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ان سے پیدا ہونے والے تکلیف دہ اثرات کی ان کی کہانیوں میں واضح جھلک ملتی ہیں۔ وہ نچلے طبقے کے انسانوں کے جذبات اور احساسات کی بڑی عمدگی سے ترجمانی کرتے ہیں۔

''بے جڑ کا درخت'' ایک ذہین شخص، مجید کی کہانی ہے۔ وہ غمِ روزگار سے گھبرا

کر محبت پور نامی گاؤں میں پناہ لیتا ہے۔ وہاں اسے ایک قدیم قبر نظر آتی ہے۔ جس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کس کی ہے۔ وہ اس قبر کا سہارا لیتا ہے۔ اسے ایک قدیم ولی اللہ کا مزار ظاہر کرتا ہے اور پھر اس کا مجاور بن کر مکر اور فریب کا چکر چلا کر علاقے کا صوفی بزرگ بن بیٹھتا ہے۔ اسے ہر طرح کا چین اور سکون ملتا ہے۔ لیکن آخر کار اس کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اسے تن تنہا اپنی قسمت کے لکھے کو قبول کرنا پڑتا ہے۔

ہر انسان کے ساتھ بہت سی الجھنیں ہوتی ہیں، بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود زمین سے اس کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا احساس جتنا ایک کسان کو یا کسی دیہاتی کو ہوتا ہے اتنا شہر والوں کو نہیں۔ اسی لئے کسان زمین سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی اپنی ماں سے۔ اسے نقصان پہنچانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ اسے خیر باد کہنا اس سے رشتہ توڑ کر دور چلے جانے کا تصور اس کے لئے بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ ''بے جڑ کا درخت'' کا مجید بھی، نام نہاد عالم دین اور صوفی بننے سے پہلے ایک غریب دیہاتی تھا۔ اس لئے جب مزار کے آس پاس کا علاقہ ایک تباہ کن سیلاب کا شکار ہو جاتا ہے اور سیلاب کا پانی مزار اور اس کے گھر کی طرف تیزی سے بڑھنے لگتا ہے۔ تو اسے احساس ہو جاتا ہے کہ اب کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی۔ وہاں کے زمیندار کا گھر ایسا ہے جو پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے محفوظ ہے، وہ اپنے خاندان کو زمیندار کی حویلی میں پہنچا کر، اپنے لئے جو راستہ اختیار کرتا ہے وہ اس کی سوچ کی بڑی عمدہ غمازی کرتا ہے۔ اس کی زندگی کے اس پریشان کن موڑ پر، وہ کیا سوچ رہا ہے اور آخر کار کیا فیصلہ کرتا ہے؟ اسے ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے؟

> ''میں اس زمین کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟..... یہ میرا گھر ہے جو میری اپنی محنت سے بنا ہے۔ مانا کہ میں اجنبی کے طور پر ملک کے اس حصے میں آیا تھا لیکن اب یہ علاقہ میرا وطن بن چکا ہے..... یہ گھر اور اس کی سلوٹوں والی ٹین کی خوبصورت چھت جو دھوپ میں چمکتی ہے..... یہ وسیع صحن جس کے چاروں طرف نفاست سے کاٹے ہوئے بانسوں کی دیوار ہے..... یہ خوشگوار جوہڑ جس میں کئی قسم کی مچھلیاں ہیں اور بانس کا پردہ ہے، جس میں، مَیں اور میرے گھر

والے خلوت میں نہاتے ہیں..... یہ مزار اور اس کی شاندار سجاوٹیں جہاں میں نے عبادت اور غور و فکر میں کئی گھنٹے بسر کئے ہیں۔ یہ سب کچھ میرا ہے۔ اب اگر یہ سب کچھ غرق بھی ہو جائے تو بھی میں اس جگہ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

جب مجید اپنے خاندان کو محفوظ جگہ پہنچا کر واپس آ رہا ہے تو اس وقت بھی اس کی سوچ کا انداز اس کے عزائم اور اس کا لائحہ عمل ایسے ہی ہیں۔ ان پریشان کن حالات میں بھی اس کے قدم بالکل نہیں ڈگمگاتے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ ان خیالات و احساسات کے ساتھ:

''اکیلے گھر آنے کا فیصلہ کو اس نے کیا تھا اس میں نہ تو بہادری کا کوئی احساس تھا اور نہ غصے یا ضد کا کوئی عنصر۔ وہ کوئی بھی جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کسی دلیرانہ کارنامے کا اسے کوئی احساس نہیں تھا۔ صرف چند گھنٹے پہلے اس نے اس بات کے مناسب جواز تلاش کر لئے تھے کہ اسے سیلاب آنے کی صورت میں بھی گھر ہی مَیں رہنا چاہیے۔ یہ اس کا گھر تھا، جو اس نے برسوں کی جان توڑ محنت، بھوک اور مایوسی کے بعد حاصل کیا تھا''۔

مجید کی پہلی بیوی رحیمہ، لمبی چوڑی بھاری بھرکم عورت ہے، جب وہ چلتی تو اس کے قدموں کی آواز صاف سنائی دیتی۔ ایک دن وہ صحن میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھی تو مجید نے اسے مشورہ دیا:

''اسی طرح نہ چلا کرو بی بی۔ اس سے زمین کو تکلیف پہنچتی ہے زمین کو یہ انداز پسند نہیں۔ اس میں توہین کا پہلو ہے۔ یاد رکھو۔ ایک نہ ایک دن سب کو اس زمین میں جا ملنا ہے''۔

یہاں بھی زمین سے انسان کے گہرے رشتے کی، اس سے عقیدت کی واضح جھلک ملتی ہے۔ سید ولی اللہ جس انداز سے مناظر فطرت بیان کرتے ہیں اور جس طرح ان کا یہ ناول شروع ہوتا ہے، اسے پڑھ کر لگتا ہے، ان کی کہانی کا مرکزی کردار بے بس انسان نہیں، وہ زمین ہے جس پر وہ پیدا ہوتا ہے اور پھر زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے، قدرتی عناصر سے نبرد آزما رہتا ہے اور آخر کو اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اسے

مشیت ایزدی سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

سید ولی اللہ کے یہاں نصیحتیں اور بیان بازی بالکل نہیں ہوتی۔ چونکہ ان کا اندازِ بیان سادہ ہوتا ہے اس لئے مجھے یقین ہے بنگلہ سے، یا اس کے انگریزی ترجمے سے ناول کو اردو کے قالب میں ڈھالتے ہوئے اس کی روح کی حفاظت کرتے ہوئے، مصنف کے فلسفے کو اردو تحریر میں جذب کرنے میں مترجم کو کوئی دقّت نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کا ثبوت یہ ترجمہ ہے جو بڑی حد تک سلیس ہے۔ ترجمہ اتنا رواں اور غیر مبہم ہے کہ اس سے سید ولی اللہ کے فن اور طرزِ تحریر کی بڑی اچھی عکاسی ہوتی ہے۔ بنگلہ میں جس طرح کی جزئیات نگاری ہوتی ہے اس کی دلکش جھلکیاں بھی اردو ترجمے میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ بعض جگہ تو یوں لگتا ہے جیسے ہم خود اس ناول کے جیتے جاگتے کردار ہوں۔

بنگلہ میں اسی انداز کی اور کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں انسان اور زمین کے رشتے کا کئی مختلف انداز میں ذکر آیا ہے کیونکہ بنگال کی بہت بڑی آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے اور گزر بسر کے لئے زمین ہی کا سہارا لیتی ہے۔ اردو، سندھی اور پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں بھی اس موضوع پر خاصا لکھا گیا ہے۔ لیکن ان میں ''بے جڑ کا درخت'' کا شدتِ احساس کم ملتا ہے۔ اس لئے اردو دان طبقے کے لئے میں اس ناول کو ایک منفرد تخلیق سمجھتا ہوں، کیونکہ اس کے مصنف نے زندگی اور کائنات کی مروجہ زاویوں سے ہٹ کر، اپنے خطے کے غریب سادہ لوح عوام کے مسائل کو دیکھنے کی کوششیں کی ہیں..... ''بے جڑ کا درخت'' اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

انور عنایت اللہ

کراچی

باب نمبر 1

بے پناہ خلقت اس دھرتی پر آباد ہے۔ اس لٹی پٹی دھرتی پر جو اَب بانجھ بن چکی ہے۔

لوگوں کو اس کا احساس ہے۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتے ہیں؟ اس کے چپے چپے پر ہل چلایا جاتا ہے۔ بوائی کی جاتی ہے۔ سال میں تین بار دھان کی تین فصلیں لینے کے لئے اور پھر پٹ سن کی خاطر جو واحد نقد جنس ہے۔ دوسری چیزیں بھی ہیں..... گنا السی کے بیج، سرسوں، تلی اور سویابین۔ سال بھر ہر روز صبح سے شام تک اس دھرتی پر بار بار ہل چلایا جاتا ہے اور فصل بوئی جاتی ہے۔ اس کے مقدر میں آرام اور سکون نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی نشو ونما کا کوئی سامان نہیں۔ کم از کم ان پیٹ بھروں کی طرف سے تو نہیں جو اس کا خون چوس رہے ہیں۔ ہاں بس سیلاب زدہ دریاؤں کی گاد ہی اس کی غذا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں لیکن وہ ہیں اس قدر زیادہ۔ کھانے والوں کا ہجوم بے پناہ اور زمین کم۔ دھرتی کو جتنا نچوڑ سکتے ہیں نچوڑتے ہیں پھر بھی بھوکے کے بھوکے۔ ایسے لوگ اگر ناآسودگی کا شکار ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ چٹانوں، پتھروں اور کنکروں سے پاک نیلے آسمان اور سبز کھیتوں کا یہ گنجان علاقہ آسودگی اور شانتی سے محروم ہے۔ وہ تو بے چینی اور بے کلی کا مارا ہوا ہے۔ اور وہ سب کے سب اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے اپنے اپنے گھروں کو خیر آباد کہیں۔ اور ان علاقوں کی طرف نکل جائیں جہاں انہیں دن میں صرف ایک بار کھانے کو پیٹ کی آگ بجھانے کو کچھ مل جایا کرے۔ وہ ایسی زمینوں کے خواب دیکھتے ہیں جہاں انہیں یہ پتہ ہو کہ وہ کیوں صبح کو اٹھتے ہیں اور رات گئے کیوں جاگتے رہتے ہیں یہاں تو کچھ بھی نہیں اور اگر کچھ مل بھی جائے تو ایسے ہی ہے جیسے آگ پر تیل کی بوند گر پڑے۔ سب کچھ کھا جانے والی بھوک کی آگ جو کبھی سرد

نہیں ہوتی اور بھوک جو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

اگر وہ بھاگ نہ سکیں تو پھر لڑنے مرنے کے سوا اِن کے لئے کیا رہ جاتا ہے؟ وہ لڑتے جھگڑتے ہیں اور ایک ایک انچ زمین کی خاطر جو اِن کی اپنی نہیں ہوتی عدالتوں کے چکر لگاتے ہیں اور اس چکر میں خود کو قرض کی زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں۔ وہ خون پسینہ ایک کرتے اور خدا سے اپنے ہمسایوں کی بربادی کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں اور پھر ایسے ہی اپنی سلامتی کے لئے بھی دعائیں کرتے ہیں۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل بھی کرتے ہیں۔ نفرت بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے آنسو بھی بہاتے ہیں۔ وہ ہم بستری کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لمحوں میں بھی بے ثمر ابدی تلاش کے خیالات ان کے ذہنوں پر چھائے رہتے ہیں۔ اب تو وہ اپنے بال بچوں کو گنتے بھی نہیں وہ ہیں ہی اتنے۔ وہ کم عمری میں مر جاتے ہیں۔ جلدی دنیا سے گزر جاتے ہیں ہاں بعض موت کی دہلیز پر ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں۔ شاید انہیں آخری سانس سے پہلے زندگی میں ایک بار اچھے کھانے کی آس ہوتی ہے۔

پھر بھی بعض بچ جاتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ ان میں پھرتی آ جاتی ہے اور ان کی آنکھیں امید سے جلنے لگتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ ان کی دھرتی سرسبز اور مہربان ہوتے ہوئے بھی اب کچھ دے نہیں سکتی۔ وہ ہیں ہی اس قدر زیادہ۔ اس پامال دھرتی پر جس پر ہل چل چکا ہے وہ ایک دوسرے کو دھکے دے رہے ہیں لڑ رہے ہیں۔

.....

پچھم کی طرف جانے والی ٹرین آدھی رات کو پہنچتی ہے۔ جب یہ لمبی اَدھ موئی ٹرین پہنچتی ہے تو خاموش ہونے سے پہلے کانپتی کھڑکھڑکرتی اور کراہتی ہے۔ وہ پہلے ہی بہت سے چھوٹے سٹیشن پار کر چکی ہوتی ہے۔ جن میں سے بعض پر مٹی کے تیل کے لیمپ روشن ہوتے ہیں لیکن وہ سب کے سب ویران اور اُداس دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں معاملہ البتہ مختلف ہے۔ سوئے ہوئے مسافر بڑبڑا کر اٹھ جاتے ہیں اور ان میں سے بعض لوگوں کو پلیٹ فارم پر دیوانہ وار بھاگتے دوڑتے دیکھ کر سہم سے جاتے ہیں۔ یہ دیوانگی، یہ بھاگ دوڑ کیسی ہے؟ آخر وہ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ حیران و پریشان وہ دیکھتے رہتے ہیں، پر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ان کے اپنے گاؤں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب وہ اپنی سیٹوں پر

آرام سے جمے بیٹھے ہیں اور ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے وہ کچھ سمجھتے نہیں۔

چیختے چلاتے لوگ ریل گاڑی کے ایک سرے سے دوسرے تک بھاگتے ہیں لیکن انہیں کوئی جگہ نہیں مل پاتی۔ یہاں اس ڈبے کے فٹ بورڈ پر چڑھ کر ذرا اندر تو جھانک لو۔ اچھا!..... یہاں بھی کوئی جگہ نہیں..... دوست اور عزیز جلد ہی بچھڑ جاتے ہیں اور پھر کھوئے ہوؤں کی تلاش کے لئے بھاگنے اور زور زور سے ان کے نام پکارتے ہیں۔ بعض کے کپڑے پھٹ گئے ہیں اور ٹوپیاں گم ہوگئی ہیں اور دوسرے اپنی متاع عزیز یعنی بدھنے سے محروم ہوگئے ہیں۔ بدھنے کے بغیر نہ تو عبادت کے لئے وضو کیا جاسکتا ہے نہ ہی حوائج ضروری کے بعد خود کو پاک کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بغیر تو سفر کے لئے پانی بھی ساتھ نہیں لے جایا جاسکتا۔ اس کی تلاش بہرطور ضروری ہے۔

پراژدہے جیسی لمبی گاڑی کے صبر کی کوئی حد نہیں۔ لوٹا کھونے والے کو اس کی تلاش کرنے دو۔ جس چھوکرے کا ایک پل پہلے تک گلے میں لٹکنے والا تعویز گم ہوگیا ہے اسے وہ ڈھونڈنے دو۔ جگہ تلاش کرنے والوں کو پناہ ڈھونڈنے دو۔ تھوڑی سی روشنی والے یارڈ کے دوسرے کنارے پر ٹرین سے الگ ہوکر انجن کسی صابر اور دانا شخص کی طرح پانی پی رہا ہے۔ اپنی پیاس بجھا رہا ہے۔

شاید اسے پتہ ہے۔ شاید وہ جانتا ہے کہ ان سب لوگوں کے لیے زمین تنگ ہو گئی ہے اور کھانے کو بہت کم ہے۔ اب ان کے پاس پاگل کرنے والی بھوک کے سوا کچھ نہیں رہا۔

دنیا کے اس حصے میں سفید ٹوپیوں کی اس قدر بہتات کا سبب شاید یہ ہے کہ زمین اب انسانوں کی بھوک نہیں مٹا سکتی۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ میری عبادت کرتے وقت اپنے سر ڈھانپ لیا کرو کہ یہ خدا سے ڈرنے والوں کی نشانی ہے۔ سو وہ اپنے سر باریک کپڑے کی ٹوپیوں سے ڈھانپے رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات ان کے کنارے کاڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ سفید ٹوپیاں الٹی کشتیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یوں وہ جتاتے ہیں کہ ان کے یہاں کتنا خوفِ خدا ہے۔ ٹوپیاں مویشیوں سے اور دھان کے گٹوں سے بھی تعداد میں بڑھ کر ہیں۔

صبح کے وقت ہوا ان لڑکوں کی آواز سے بوجھل ہوتی ہے جو مکتبوں میں مل کر قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس وقت شدت سے احساس ہوتا ہے کہ یہ خدا کی زمین

ہے ذرا ان لڑکوں کو دیکھو، بلوغت کے آثار ظاہر ہونے سے بھی پہلے وہ قرآن حفظ کر لیتے ہیں اور ننھے منے حافظ بن جاتے ہیں۔ان کے جواں چہرے خوشی سے دمکنے لگتے ہیں۔زیادہ دن ان کی آنکھوں میں فخر اور اطمینان کی چمک نہیں رہتی۔زیادہ دن دنیاوی قصوں اور محروموں، بیکسوں کی نرم روی کے بارے میں حقارت اور بے نیازی کا رویہ برقرار نہیں رہتا۔اعتماد کے ساتھ وہ بس چند روز ہی چلتے ہیں۔تذبذب کے ساتھ ان کی قرابت کرنے والی خوش لحن آوازیں مہین اور تیز ہو جاتی ہیں۔

جو ہمت والے ہوتے ہیں مزید مذہبی تعلیم کی خواہش کرتے ہیں۔کسی شب وہ آدھی رات والی ٹرین سے اپنے گھروں کو خیر باد کہتے ہیں اور ان مقامات کو چلے جاتے ہیں جو اپنے دینیاتی اداروں کے لیے جانے پہچانے ہیں۔وہاں وہ کرم خوردہ بڑی بڑی کتابوں کے ورق چاٹتے رہتے ہیں۔ماضی کی دنیا میں رہنے لگتے ہیں۔سپنوں میں کھو جاتے ہیں۔خوش باش اور مغرور رہتے ہیں۔خدا کے لفظ تو ابدی اور زندگی بخش ہیں۔وہ ان کے چہروں کو انبساط سے ایک بار پھر چمکا دیتے ہیں۔

یہ انبساط عارضی ہی ثابت ہوتا ہے۔جلد ہی انہیں احساس ہوتا ہے کہ بوسیدہ کتابوں کے الفاظ سے نہ تو ان کے پیٹ بھرتے ہیں اور نہ ہی ذہن کو مستقل سکون نصیب ہوتا ہے۔تالاب کے کنارے پکی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ وضو کرتے ہیں۔اپنی ٹوپیاں اتار دیتے ہیں اور ٹھنڈی ہوا میں سانس لیتے ہیں۔لیکن انہیں کسی خنکی کا احساس نہیں ہوتا۔جب وہ سورج سے چمکتے ہوئے افق کی طرف نگاہیں کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

لہٰذا وہ پھر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔وہ ان لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں جو کارخانوں میں مزدوری کرنے، خانسامے اور بیرے بننے، جلد سازوں کے شاگرد ہونے، پریس میں مشینیں چلانے، کھالیں رنگنے کے کارخانوں میں کام ڈھونڈنے اور ملاح بننے کے چکر میں گھروں سے نکل کر شہروں کا رُخ کرتے ہیں۔تاہم جن کی آنکھیں خدا کے نور سے زیادہ ہی سرشار ہوتی ہیں۔وہ امام یا مؤذن بن جاتے ہیں۔پر ان کی حالت بھی مزدوروں سے شاید ہی بہتر ہوتی ہے۔بعض شہروں اور نواحی بستیوں کی مسجدوں میں پہنچ جاتے ہیں لیکن دوسروں کو دور دراز دیہاتوں میں جانا پڑتا ہے۔جہاں پہنچنے کے

لیے ہفتوں تک ٹرین میں کھڑکھڑاتی بسوں میں اور پیدل سفر کرنا پڑتا ہے۔ کتنی خشک ندیاں اور اُمنڈتے دریا عبور کرنا پڑتے ہیں اور بیل گاڑیوں میں بھری گھاس پھوس پر سونا پڑتا ہے۔

ایک روز ایک افسر جو بظاہر معائنے کے دورے پر تھا۔ اپنے ضلع سے دور شمال میں گاڑو کی جنگلی پہاڑیوں کی طرف ایک ذرا شکار کی غرض سے جا نکلا۔ افسر کی داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ خاکی پتلون قمیض پہن رکھی تھی۔ کندھوں سے ایک بھاری بندوق لٹک رہی تھی۔ جنگل کی گہرائیوں میں جب اس نے مؤذن کی آواز سنی تو اسے بے حد تعجب ہوا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا۔

بعد میں اسی روز وہ مؤذن سے ملا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی اپنے گھر سے، اپنے لوگوں سے دور اِن پہاڑیوں کی تنہا اداس زندگی کی غمازی کر رہی تھی۔

''جناب آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟'' مؤذن نے بڑی انکسار کے ساتھ پوچھا جو ایک صاحب حیثیت شکاری کو روبرو پانے سے پیدا ہونے والی بے کلی پر پردہ ڈال رہی تھی۔

شکاری نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ابھی تک مؤذن نے سانس روک رکھا تھا۔ اسی کیفیت میں دوبارہ پوچھا ''اور جناب کا نام؟''

شکاری کے نام سے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہے پھر تو مؤذن کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔''

اب شکاری نے اس سے بہت سے سوال پوچھے۔ اپنے گھر کا ذکر کرتے ہوئے مؤذن کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اس کی یادیں تلخ و شیریں تھیں، پر اس نے اپنی زبان پر قابو پالیا۔ اس نے بتایا کہ یہاں کے لوگ صدیوں سے خدا کے نور سے محروم چلے آرہے تھے۔ شاید اس کی آمد سے پہلے ان بدبختوں تک خدا کی روشنی پہنچی ہی نہ تھی۔ وہ جاہل اور بے دین تھے۔ جب اس نے انہیں دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے یہیں لوگوں میں رہ کر اسے ایک فریضہ انجام دینا ہے۔ لہٰذا اس نے یہاں ڈیرا ڈال لیا۔

مگر اس نے اپنے گاؤں کی کوئی بات نہ کی جہاں لوگ بہت تھے اور روٹی کم تھی نہ ہی اس نے کچل دینے والے افلاس اور قحط کے دنوں کا کوئی ذکر کیا۔

دور پہاڑیوں سے شیر کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ کبھی کبھار اس علاقے میں جنگلی ہاتھی برفانی تودوں کی طرح پہاڑیوں سے نیچے آتے اور سامنے آنے والی ہر شے کو روند ڈالتے۔ تباہ کر دیتے تھے۔ لیکن اب اونچے شال کے درختوں پر دن میں پانچ بار مؤذن کی پتلی اور تیز آواز گونجتی اور سننے والوں کو خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دیتی۔

شکاری نے سوچا کہ راتوں کو اکثر اس تنہا شخص کی آنکھیں ضرور آنسوؤں سے بھر جاتی ہوں گی۔ ضرور اسے اپنے لوگوں اور اپنے گھر کی یاد ستاتی ہوگی۔

گھنے درختوں اور پودوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والی ہلکی ہوا میں مؤذن کی ہلکی پھلکی داڑھی پھڑ پھڑاتی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے نرمی سے اس پر ہاتھ پھیرا۔

''جناب کبھی کبھار تو میں اس تنہا زندگی سے بہت ہی تنگ آ جاتا ہوں۔ لیکن سوچتا ہوں کہ میں نے اپنا فرض اچھی طرح ادا کیا ہے۔ خدا میرا گواہ ہے''۔ وہ ایک پل کے لئے رُکا۔ پھر کہنے لگا ''شاید کسی روز میں یہ جگہ چھوڑ کر کسی طرف کو نکل جاؤں گا''۔

شکاری اپنی بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ پر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ تنہائی کا مارا شخص راتوں کو کیا واقعی روتا ہوگا۔

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ مؤذن پھر بولا ''ادھر شمال کی طرف جناب جو آپ کا علاقہ ہے، وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟''

شکاری نے جواب دینے سے پہلے قدرے تامل کیا۔

''وہ بہت اچھے ہیں۔ جو وہ چاہتے ہیں، انہیں کھانے کو مل جاتا ہے، ان کے پاس بہت سی پٹ سن اور تمباکو بھی ہے۔ بس وہ خوش وخرم ہیں''۔

مؤذن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یونہی بات بنانے کو اس نے پوچھ لیا ''اچھا تو وہ خدا سے ڈرتے بھی ہیں؟ نماز پڑھتے ہیں؟ رمضان میں روزے رکھتے ہیں؟''

ایک آنکھ بند کر کے شکاری نے اپنی بندوق کی نالی میں جھانکا۔

''وہ خوش ہیں۔ لیکن شاید خدا خوفی ان میں نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ زیادہ خدا خوفی نہیں ہے''۔

مؤذن خاموش رہا۔ کتنی ہی دیر دونوں یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ سورج شال کے اونچے اونچے درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔

باب نمبر 2

جولائی کے مہینے میں ایک روز جب کہ سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا اچانک ہوا بالکل بند ہوگئی۔ ہر شے پر عجب سا سکوت طاری ہوگیا۔ دھان کے کھیت، دلدلیں، برساتی پانی کے بڑے بڑے جوہڑ اور ان کے ساتھ ساتھ دھندلا نیلا آسمان کسی مردہ جانور کے دل کی طرح ساکن ہوگیا۔

گرمی اور حبس سے دم گھٹنے لگا تھا۔ تپش کے مارے سارے بدن میں چبھن ہو رہی تھی لیکن پانی میں ڈوبے دھان کے کھیتوں میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے یہ ایک اچھا دن تھا۔ مچھلی ذرا حرکت کرتی تو فوراً ہی سب کو اس کا پتہ چل جاتا اور ایک بار جب مچھلی کا پتہ چل جائے تو پھر اسے قابو کرنا دشوار نہیں ہوتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ گھروں سے نکلے اور دھان کے کھیتوں میں مچھلیاں تلاش کرنے لگے۔

ان میں طاہر اور قادر دو بھائی بھی شامل تھے۔ اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھے وہ احتیاط اور خاموشی سے پانی میں جا رہے تھے۔ سامنے کے حصے میں طاہر بے حس وحرکت کھڑا ہوگیا۔ مچھلی مارنے کا برچھا اس کے دائیں ہاتھ میں تھا اور وہ ایک جانب مسلسل نظریں جمائے ہوئے تھا۔ قادر نے ایک پتلے بانس کے ساتھ کشتی کو ہچکولا دیا۔ اشارے کے لئے وہ اپنے بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک طاہر ساکت ہوگیا، منہ کا رخ بدلے بغیر اس نے بڑی انگلی کے ہلکے اشاروں سے قادر کو راہ دکھائی اب بائیں جانب ذرا سا آگے۔ دھان کے پودوں میں شاید ہی کوئی حرکت پیدا ہوئی ہو لیکن شدید حبس کی وجہ سے معمولی سی حرکت بھی اپنا اثر چھوڑتی تھی۔ طاہر نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ذرا سا اور بائیں طرف۔ آہستہ

سے۔بس۔رک جاؤ۔

مچھلی اب بھی وہاں تھی۔مزے سے تیر رہی تھی۔آنے والے خطرے کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔ادھر ادھر گھومنے والی کشتیاں بھی رک گئیں اور ان پر سوار لوگ پوری طرح تنے ہوئے تیر کی مانند طاہر کے کالے پسینے سے شرابور جسم کو توجہ سے دیکھنے لگے۔اس کے جسم کا بالائی حصہ جھٹکے کے ساتھ آگے کو جھکا اور بجلی کی طرح برچھے کی چمک دکھائی دی۔مچھلی قابو میں آ گئی تھی۔

دیکھنے والوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان کی کشتیاں پھر سے چلنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اور بڑی احتیاط کے ساتھ۔

دونوں بھائی اس حبس زدہ سہ پہر میں چاروں طرف افق تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں میں مچھلیوں کو تلاش کرتے رہے۔وہ شمال کی طرف گئے اور پھر مشرق کی طرف۔جب سورج دور افق میں غروب ہو رہا تھا تو وہ اب بھی مچھلیوں کی تلاش میں مٹی گنج روڈ کی طرف پہنچے ہوئے تھے۔وہاں انہوں نے اسے دیکھا۔

قادر نے دیکھا کہ اس کا بھائی سڑک کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہے۔اس نے اپنے بھائی کی نگاہوں کا پیچھا کیا۔

انہوں نے پتلی سی داڑھی والے ایک اجنبی کو سڑک کے بیچ کو کھڑے دیکھا۔اس نے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔منہ کا رخ آسمان کی طرف تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ وہ عبادت کر رہا تھا۔لمحے گزرتے رہے لیکن وہ یونہی کھڑا رہا۔ساکن اور گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر جیسے حبس زدہ دن نے اسے پتھر کے مجسمے میں ڈھال دیا ہو۔

''یہ اجنبی کون ہے؟'' طاہر نے سرگوشی کی۔اس کا بھائی خود اپنے آپ سے یہی سوال پوچھ رہا تھا۔یہ اجنبی کیا کر رہا ہے اور وہ کیوں اس طرح دعائیں مانگ رہا ہے؟ حیرانی کے عالم میں وہ اسے دیکھتے رہے۔

بالآخر اجنبی نے اپنے ہاتھ منہ پر پھیرے اور اپنی دعا ختم کی۔اچانک اس نے سڑک پر پڑی ہوئی اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائی اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا شمال کی طرف بڑھنے لگا۔شمال کی طرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر محبت پور کا گاؤں تھا۔دونوں بھائی اسی گاؤں میں رہتے تھے۔

''وہ شمال کی طرف جا رہا ہے۔'' طاہر نے کہا''اچھا تو کیا وہ ان کے گاؤں جا

رہا تھا؟

شام کو محبت پور پہنچنے پر سب سے پہلے انہوں نے پکڑی ہوئی مچھلیوں میں سے آدھی کشتی کے مالک کے حوالے کیں اور باقی آدھی اپنے پاس رکھ لیں۔ گھر واپس آتے ہوئے وہ زمیندار خلیق کی حویلی کے سامنے سے گزرے جہاں انہوں نے ڈیرے میں ہجوم دیکھا۔ اشتیاق کے عالم میں انہوں نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ تقریباً سارا گاؤں ہی وہاں امڈ آیا تھا۔ خود ان کا باپ بھی ہجوم میں بیٹھا تھا۔ لیکن بھیڑ کے باوجود ماحول پر تقدس سا چھایا ہوا تھا اور لوگ احترام اور گہری سوچ کے عالم میں دکھائی دیتے تھے۔ ان کے درمیان لیکن لوگوں سے ذرا فاصلے پر وہ شخص بیٹھا تھا جسے دونوں بھائیوں نے مٹی گنج کی سڑک پر دیکھا تھا۔ وہ دونوں بھی آگے بڑھ کر بیٹھ گئے اور غور سے اجنبی کو دیکھنے لگے۔ ہاں یہ وہی شخص تھا۔ وہی اجنبی جسے انہوں نے سڑک پر عبادت کرتے دیکھا تھا۔ دبلا پتلا شخص جو اَب آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔'' صرف اس کے ہونٹ جنبش کرتے دکھائی دیتے تھے، پر کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے آہستگی سے چاروں طرف دیکھا۔ بلا وجہ، بلا سبب اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں۔

''تم سب اندھے ہو'' وہ ملامت کرتے ہوئے چیخا۔ ''تم سب کے سب جاہل ہو؟ تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ اگر تم دیکھ سکتے تو پھر اس قبر کو..... نہیں نہیں..... یہ قبر نہیں، یہ تو مزار ہے۔ کیسے تم سائیں اشفاق شاہ کے مزار کو یونہی چھوڑ دیتے؟''

اتنا کچھ کہنے کے بعد اجنبی نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی سے عبادت کرنے لگا۔ لیکن یہ خاموشی لمحاتی تھی۔ جلد ہی اس کا غصہ پلٹ آیا۔ شدید طیش کے عالم میں اس نے ہجوم کو دیکھا اور کہنے لگا ''ہاں وہ درویش تمہارے درمیان جیتا رہا ہے۔ لیکن تم نے اس کی پروا نہیں کی۔ تم اسے پہچان ہی نہ سکے۔ پر وہ اب مرنے کے بعد بھی زندہ ہے۔ تمہارا خیال رکھتا ہے۔ تمہاری حفاظت کرتا ہے اور دیکھو تم نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے مگر وہ رحم دل ہے۔ ورنہ تمہارے کرتوتوں کی سزا میں وہ تمہارے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیتا۔ تمہاری فصلیں خشک سالی کا شکار نہ ہو جاتیں؟ تمہارے بچے وباؤں سے مر جاتے؟ مگر وہ رحم دل ہے اور اس کے کرم کی کوئی حد نہیں۔''

ہجوم یوں خاموش تھا جیسے گہرے پچھتاوے کے عالم میں ڈوبا ہو۔ لیکن وہ حیران

تھے۔ ہاں وہ شکستہ اور پرانی قبر کو اچھی طرح جانتے تھے جسے گاؤں سے باہر گھنے جنگل نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ بانس کے درختوں کے گھنے جھنڈ کے درمیان لگتا تھا کہ اس پر افسردگی طاری ہے۔ سیلن نے اسے کتنا خستہ کر دیا تھا۔ شاید ہی کسی نے کبھی اس پر توجہ دی تھی۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کس قدر پرانی ہے۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس کی دو اطراف کو ضائع کر دیا تھا۔ جہاں کہیں سے پلستر اکھڑ گیا تھا۔ وہاں سے کائی زدہ کالی اینٹیں ویرانی کی منہ بولتی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ گاؤں والوں کے لئے وہ ایک عجیب و غریب بھید کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہاں وہ گاؤں سے باہر تھی اور گاؤں والوں کے قدموں کی چاپ وہاں تک نہ پہنچتی تھی۔ وہ گھنے جھنڈ کے اندھیرے سے خوف کھاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ بھوتوں کا مسکن ہے۔ آخر انہیں کیونکر پتہ چلتا کہ وہ کیا نام ہے اس کا سائیں شاہ اشفاق کی قبر، نہیں نہیں، مزار ہے۔

ہجوم کے پیچھے سے شکایت کے لہجے میں ایک آواز اُبھری''۔

''ہمیں کیسے پتہ چلتا؟ وہ تو گاؤں سے باہر ہے، نہیں ہے کیا؟''

اجنبی نے گردن موڑی۔ اس کی نظریں بولنے والے شخص کو تلاش کرنے لگیں۔ کامل سکوت کے عالم میں اس نے اسے دکھا۔

''کیا تم اپنے گاؤں سے باہر دھان نہیں اُگاتے۔ مویشی نہیں چراتے اور مچھلیاں نہیں پکڑتے؟''

اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس مداخلت کے بعد اجنبی نے خاموشی سے دعا مانگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں نرمی بلکہ یوں کہیئے کہ اداسی جھلک رہی تھی۔

''میں گھاڑو پہاڑیوں کی طرف سے آیا'' اس نے کہنا شروع کیا۔ جو مادھو پور سے تین دن کے فاصلے پر ہیں۔ میں وہاں خوش تھا۔ امن سکون سے تھا۔ اپنے حال پر قانع تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ خدا کے دین سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ نرے وحشی تھے۔ البتہ ایک بات ہے اور وہ یہ کہ ان کے دل کھرے تھے۔ وہ فیاض اور مہمان نواز تھے۔ ان کے پاس بہت سی خوراک اور مویشی تھے پھر بھی وہ خوش نہ تھے۔ جنت کی روشنی سے دور ہو کر کوئی خوش ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ خدا کی راہ

دکھانے کے لئے میں ان کے ساتھ رہنے لگا۔ میں نے انہیں خوشی عطا کی اور بدلے میں انہوں نے مجھے خوش کیا۔ ہاں، میں وہاں بہت خوش تھا، لیکن .....اجنبی ایک پل کے لئے رُکا اور اس نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔ ''ایک رات میں نے ایک خواب دیکھا''۔

جب سے اس نے بولنا شروع کیا تھا، لوگ خواب کا ذکر کتنی مرتبہ سن چکے تھے لیکن ایک بار پھر سننے پر آمادہ تھے۔ وہاں وہ ان پہاڑی لوگوں کے درمیان خوشی سے دن گزار رہا تھا جن کے پاس کھانے کو بہت کچھ ہے اور بہت سے مویشی بھی ہیں۔ لیکن ایک رات اس نے ایک خواب دیکھا۔

اس نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

''اس خواب نے مجھے وہ جگہ اور پہاڑیوں کے اچھے لوگوں کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس خواب کے سبب میں نے خوش وخرم لوگوں کے درمیان اپنے شاد آباد گھر کو تیاگ دیا۔ لیکن یہ سب کچھ میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کیا اور کسی تامل کے بغیر یہ لمبا اور دشوار سفر طے کیا ہے''۔

ہاں اسے وہ رات اچھی طرح یاد تھی۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد وہ بستر میں جا لیٹا تھا۔ رات خنک سی تھی۔ سارا دن بارش ہوتی رہی تھی۔ آسمان صاف تھا اور بانس کی دیوار کی دراڑوں میں سے چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ سکتا تھا۔ جنگل میں پرندے اور جانور خاموش تھے۔ ہر شے پُرسکون تھی۔

''خواب سے پہلے ایک بار میری آنکھ کھلی'' اس نے کہا۔ وہ پتہ نہیں وقت کیا تھا۔ لیکن ابھی رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پُرسکون اور خاموش رات۔ چاند کی چاندنی جامد پڑ چکی تھی۔ شاید صبح ہونے کو تھی۔ میں اچانک جاگ پڑا۔ نجانے کیوں اور میں دوبارہ سونے کا ایک خاص سبب تھا۔ میں وہ خواب دیکھنے والا تھا۔''

اچانک وہ زور زور سے قرآن کی آیت پڑھنے لگا۔ ''خدا ہی سب کچھ جانتا ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ میرے بھائیو! ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ سوائے اس کے جو خدا ہمیں بتاتا ہے۔''

خاموش ہو کر اس نے دروازے سے باہر رات کے اندھیرے کو پھیلتے دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آہستہ سے اس نے سر اٹھایا اور کہنے لگا۔ ''کیا وہ سچ مچ خواب تھا؟ کیا ایسی کوئی بات خواب بھی ہو سکتی ہے؟'' وہ رکا۔ اس کی آنکھیں

آنسوؤں سے ڈبڈبانے لگی تھیں۔ ''ہاں میں نے اسے دن کی مانند صاف دیکھا۔ کسی دھند کسی اندھیرے کا نشان تک نہ تھا۔ وہ ظاہر ہوا اور اس نے مجھے آواز بھی دی۔ اس نے کہا جاؤ وہاں۔ محبت پور چلے جاؤ کہ وہاں کے باسی نہیں جانتے کہ میں ان کے درمیان رہتا ہوں مگر میرا وہ کوئی خیال نہیں کرتے۔ کوئی توجہ نہیں دیتے۔ ان سے کہو میرا پاس لحاظ کریں ان سے کہہ دو کہ میں ان کے لئے دعا کروں گا۔ انہیں خوشحالی اور خوشیوں سے نوازوں گا۔

اجنبی خاموش ہوگیا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ خاموشی کے ان لمحوں میں ستر سالہ کلیم اچانک بے قابو ہوگیا اور زور زور سے رونے لگا۔ وہ روتا رہا مگر آنکھ میں آنسو نام کو نہیں تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں اب آنسو رہے ہی کہاں تھے۔ جب وہ رو رہا تھا تو اجنبی کے ہونٹوں میں دعا کے سبب جنبش پیدا ہو رہی تھی۔

یوں اس خاموش دن جب کہ کوئی مچھلی خفیف سی حرکت بھی کرتی تو اپنی موجودگی کی چغلی کھاتی اور پرچھے کی زد میں آجاتی۔ مجید محبت پور میں داخل ہوا۔ ایک کرتا، دو لنگیوں، دو بوسیدہ تولیوں اور گردن کے ساتھ لٹکنے والے قرآن کے ساتھ وہ آیا اور فوراً ہی اس دھرتی میں اپنی جڑیں بنالیں۔ اتنی گہری کہ گاؤں کے سب سے بڑے درخت کی جڑیں بھی شاید اتنی گہری نہ ہوں۔

اس رات سونے سے پہلے مجید نے خود سے سرگوشی کی۔ ''قسمت مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میں یہاں رہوں گا۔ شاید طویل عرصے تک''۔ اس نے آنے والے دنوں کا اندازہ کرنا چاہا لیکن ابھی کچھ بھی واضح نہ تھا۔ بس ابہام ہی تھا شاید موت اور قیامت کا دن۔ لیکن کوئی شکل واضح نہیں تھی۔ وہ صرف ماضی کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس میں خوشی کا سامان ہی کیا تھا۔

اس نے دل میں کہا کہ بہرحال ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔

پھر ایک پل کے لئے اسے خوف سا لگا کہ جو کھیل وہ کھیل رہا ہے۔ وہ خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ طرح طرح کے وہم اس کے دل میں پیدا ہونے لگے۔ پھر اس نے خود کو یقین دلایا کہ اس گاؤں کے لوگ بڑے سیدھے سادے اور نیک دل ہیں۔ اس نے شام کا منظر یاد کیا کہ کیسے سب لوگ اس کے آگے آنکھیں نیچے کئے بیٹھے تھے۔ اس کا اعتماد واپس آنے لگا۔

مجید نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ ہم سب یہ بات بھول جاتے ہیں کہ خدا بڑا

مہربان اور سب کچھ معاف کرنے والا ہے۔ وہ غفور ورحیم ہے۔ اگر ہم ندامت اور عاجزی سے معافی مانگیں تو وہ ہمارا ہر گناہ معاف کر دیتا ہے۔

رات کی خاموشی میں صرف دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ آرام سے لیٹے ہوئے، مجید اس نئی زندگی پر غور کر رہا تھا جو اس نے اپنے لئے منتخب کی تھی کیا کسی اچھی بات کے لئے جھوٹ بولنا برا ہے؟ بار بار یہ سوال اس کے ذہن میں آ رہا تھا۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں کے لوگ خدا سے کم ہی ڈرتے ہیں اور اس کی عبادت بھی کم ہی کرتے ہیں۔ اگر میں خدا کا خوف دلانے کے لئے تھوڑی بہت حیلہ سازی کروں تو وہ یقیناً مجھے معاف کر دے گا۔

اس نے بستر میں پہلو بدلا۔ اب بھی وہ خاموش تھا۔ پھر اسے ایک اور خیال آیا اگر میں کدا کے نام پر اپنی روزی بھی کما لوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ آخر مجھے بھی تو زندہ رہنا ہے اور میں خدا کا پیغام پھیلانے کے لئے ہی زندہ ہوں۔

''اللہ اکبر'' اس نے قدرے بلند آواز میں کہا اور سو گیا۔

باب نمبر 3

''میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنا اور اپنے اہلِ خانہ کا پیٹ بھرنے کے لیے کھیتوں اور فصلوں کی ضرورت ہے۔ تمہیں بچے پیدا کرنے اور ان کے لیے گھر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے''۔ آم کے درخت کے سائے میں کھڑے ہو کر مجید نے کہا ''لیکن یہ تمہارے لیے کافی نہیں ہے'' اس سے تم مطمئن نہیں ہو سکتے۔ تمہاری پٹ سن اور تمباکو سے اچھی خاصی رقم مل جاتی ہے۔ مگر تم چاہتے کیا ہو کہ تمہیں اس سے زیادہ ملے۔ تمہارے پاس اچھی خاصی زمین ہے لیکن تمہیں اس سے زیادہ کی ہوس رہتی ہے۔ تم اپنی دولت اپنے بچوں کی شادی پر، فضول کھانوں، گناہ آلودہ ڈھول باجوں اور کھیل تماشوں پر اپنی بیویوں کے کپڑوں اور زیور پر ضائع کر دیتے ہو۔ یہاں تک کہ تم اپنی پسندیدہ بکریوں کی گردن میں قیمتی گھنٹیاں بھی باندھتے ہو''۔

لمحہ بھر کے لیے مجید رکا۔ اس نے اپنی چھدری داڑھی میں نرمی سے ایک انگلی پھیری اور اپنی تاسف بھری نگاہوں سے دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ پھر گرد جمع ہونے والے لوگوں کی طرف اس نے دیکھا اور دوبارہ بات شروع کر دی۔

تمہارے دل خدا سے دور ہو چکے ہیں۔ تم اس دنیا اور اس کی لذتوں میں کھو گئے ہو۔ تمہیں کبھی دوسری زندگی کا خیال نہیں آتا جو اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جہاں کی زندگی ابدی ہے اور جہاں فیصلہ تمہارے اس زندگی کے اعمال سے ہوگا۔ بھائیو اس بات سے میرا دل دکھی ہو جاتا ہے''۔

بعد میں وقت کے ہاتھوں لٹے پٹے مزار کے قریب کھڑے ہو کر اس نے یونہی بے خیالی میں گلے میں لٹکنے والے خلال سے دانت صاف کیے۔ پھر قبر کی طرف دیکھا اور گہرے خیالوں میں ڈوب کر کہنے لگا ''ہاں یہیں سے ہمیں آغاز کرنا ہوگا''۔

ایک ہفتے کے اندر قبر کے گرد و پیش اگنے والے جنگلی پودوں کا صفایا کر دیا

گیا۔ گھاس کاٹی گئی اور درختوں کی کانٹ چھانٹ کی گئی۔ اب دھوپ قبر تک پہنچنے لگی تھی جو مدتوں سے گہرے سایوں تلے چھپی رہی تھی۔ اینٹوں، ریت، چونا اور سیمنٹ نے جلد ہی مزار کی کایا پلٹ دی۔ اس کے اوپر ولیوں کے مزاروں کی طرح سرخ چادر ڈال دی گئی۔ جس کے کناروں کے گرد پیلا گوٹا لگا تھا۔ دھوپ اور بارش سے بچاؤ کی خاطر اس پر لکڑی کے چار ستونوں پر کھڑی ٹین کی چھت ڈال دی گئی۔ سرہانے کئی موم بتیاں اور چاروں طرف اگر بتیاں جلا دی گئیں۔ قبر کے کنارے پر ایک لمبے بانس پر ایک جھنڈا بھی لہرانے لگا تھا۔

نامعلوم قبر اب ایک مزار بن چکی تھی۔ ایک درویش کا مسکن جو مرنے کے بعد بھی زندہ تھا۔

جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں مجید نے کہا ''تم نے خدا کو راضی کر لیا ہے'' کسی نامعلوم شخص کی ویران قبر کو مزار میں تبدیل کرنے کی خاطر جس قدر روپے پیسے کی ضرورت تھی۔ اس کا زیادہ حصہ زمیندار خلیق نے دیا تھا۔ اب وہ خوشی اور فخر سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ بڑی عقیدت کے ساتھ اس نے کہا ''شاید اب ہمیں اس درویش کو برسوں تک نظر انداز کرنے کی معافی مل جائے۔''

مجید نے ایک اطمینان محسوس کیا اور دل میں کہا کہ یہ سیدھے سادے لوگ ہیں اور کسی حد تک احمق بھی ہیں۔ یہ جنوب مشرق کے ان لوگوں جیسے نہیں ہیں۔ جہاں سے میں آیا ہوں۔ وہاں کے لوگ تو فریبی، عیار مکار اور شکی ہیں۔ شدید بھوک اور زندگی کے لیے مسلسل پیکار نے انہیں ایسا بنا دیا ہے۔ لیکن یہاں کے لوگ بہت سادہ دل ہیں۔ مضبوط اور توانا ہیں۔ مگر کسی قدر سادہ لوح ہیں۔ وہ بس اپنے کھیتوں، اپنے دھان، اپنی پٹ سن اور اپنے تمباکو ہی سے واسطہ رکھتے ہیں۔ بس اپنے پیٹ کی ضرورتوں کو سمجھتے ہیں اور ان سے آگے کچھ نہیں جانتے۔ وہ تو کبھی یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ سب کچھ، ان کی خوراک، ان کی صحت اور ان کی خوشیاں آتی کہاں سے۔ خدا کو صرف اس وقت یاد کرتے ہیں جب ان کی زمینیں خشک سالی سے سوکھ جاتی ہیں یا جب سیلاب ان کی فصلوں کو بہا لے جاتے ہیں۔ عام دنوں میں شاید ہی کوئی یہاں خدا کا نام لیتا ہو۔

ہاں یقیناً! وہ بدل جائیں گے۔ شاید بدلنا شروع ہو بھی گئے ہیں۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ ان لوگوں کے یہاں اس کے اور مزار کے لیے کس قدر احترام تھا۔ تاہم یہ

کافی نہ تھا۔

مجید کتنے دنوں تک چپکے چپکے گاؤں والوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے طور طریقوں، ریت رسموں کو سمجھ لے۔ ان کے دماغوں میں اتر جائے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ خوش باش لوگ ہیں۔ باقی گاؤں میں جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں۔ لوگوں نے وقار کے اور آبرو کے مسئلے بنا رکھے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص محض عداوت کی خاطر اپنی گائے کو چرانے کے لیے دوسرے کے کھیت میں چھوڑ دیتا ہے۔ میری گائے تمہاری گھاس کھائے گی اور میں تمہیں سبق سکھاؤں گا! کوئی شخص اس لیے بھی دل میں کینہ رکھتا ہے کہ جب اس کا بیٹا اپنی دلہن کو لینے سسرال گیا تھا تو وہاں اس کی زیادہ آؤ بھگت نہیں ہوئی تھی۔ تاہم عام طور پر یہ خوش باش اور ملنسار لوگ تھے۔

بس کام کے وقت ایسا ہوتا تھا۔ جب وہ بے حد سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ ہانپتے کانپتے اور پسینے سے شرابور وہ انتھک محنت کرتے تھے اور کبھی شکایت نہ کرتے تھے۔ مئی کی چلچلاتی دھوپ ہو یا برسات کی بارش کہ کئی کئی دن تک لگاتار ہوتی رہتی تھی وہ ہر حال اپنے کام میں جُتے رہتے تھے۔ سردیوں کی برفانی ہوائیں چلتیں تو وہ کمر تک گہرے پانی میں گھنٹوں کام میں مصروف رہتے تھے۔ کھیتوں میں دیکھتے دیکھتے گھاس کھڑی ہو جاتی اور وہ اس گھاس پھوس کو صاف کرتے ہوئے ان کے زخمی پیروں سے خون رسنے لگتا اور جونکیں ان کا خون چوسنے لگتیں۔ لیکن ہر شے سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے کام میں جتے رہتے۔ ان کی ساری توجہ کا مرکز ان کے کھیت تھے۔ مجید نے دل ہی دل میں جانا کہ یہ لوگ بہت محنتی ہیں مگر انہیں محنت کا صلہ بھی ملتا ہے۔ ان کا حال میرے لوگوں جیسا نہیں جو محنت تو بہت کرتے ہیں لیکن اس کے ثمر سے محروم رہتے ہیں۔

سردیوں کے بعد کبھی کبھار جب بادل غائب ہوتے اور جب آسمان پر سورج ہفتوں تک مسلسل چمکتا رہتا تو زمین سوکھ جاتی اور اس میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ جاتیں۔ ایسے وقتوں میں محبت پور کے لوگ روز بارش کے لیے لو لگاتے۔ لیکن خاکستری نیلے کھلے آسمان پر سورج بے رحمی سے آب و تاب سے چمکتا رہتا۔ دھان کے نرم و نازک خوشے جو گویا زمین سے چوری چھپے نشوونما پانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے، مرجھانے اور سوکھنے لگتے۔ کسان روز لپک جھپک کھیتوں کی طرف جاتے اور دلدلی زمینوں سے پانی کی چھوٹی سے دھار حاصل کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کر دیتے کبھی کبھی وہ ساری رات اسی کام

میں مصروف رہتے۔ یہ ایسے دن ہوتے کہ جب ان میں سے ایسے غصیلے لوگ بھی جو ذرا سی بات پر لڑنے مرنے اور کلہاڑی سے اپنے ہمسائے کا سرتن سے جدا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ بے حد مسکین اور بچوں کی طرح خوف زدہ ہو جاتے اور دھان کے پودوں کو کھیتوں میں خشک ہوتا دیکھ کر سہم ہو جاتے۔ پھر وہ جنوں کی طرح اپنی فصل کو بچانے کی خاطر رات دن ایک کر دیتے۔

امیدوں اور منصوبوں سے بے نیاز تقدیر کبھی کبھار اور طرح سے بھی ان کے امتحان لیتی تھی۔ کبھی یوں ہوتا کہ سب کچھ بظاہر ٹھیک ٹھاک دکھائی دیتا۔ شاندار فصل ہوتی اور جب کٹائی کے دن آتے تو جانے کہاں سے کالے سیاہ بادل امڈ آتے اور اس اناج کو برباد کر دیتے جو ان کی جھولی میں آنے کو تیار ہوتا تھا۔

حقارت سے مجید نے سوچا کہ ایسے وقتوں ہی میں ان لوگوں کو خدا یاد آتا ہے۔ وہ کھیت کے کنارے ایک ڈراؤنے پتلے کی طرح کھڑا کسانوں کے ایک گروہ کو کچھ فاصلے پر جان مارتے دیکھ رہا تھا۔ ہاں یہ لوگ بدل جائیں گے۔ اس نے خود سے سرگوشی کی اپنے سر کو ہلایا اور سوچنے لگا جلد ہی سب کچھ بدل جائے گا۔ مصیبت یہ ہے کہ جن مصیبتوں اور دکھوں کی داستانیں یہ مجھے سناتے ہیں ان کے باوجود تقدیر ان پر مہربان ہی رہی ہے۔ اسی لیے وہ خوش ہیں۔ لیکن خوشی خطرناک بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ہمیں ہمارا حقیقی فرض بھلا دیتی ہے۔

یہ بھی ہے کہ یہ لوگ گاتے بہت ہیں۔ خاص طور پر کٹائی کے دنوں میں تو جھومتے رہتے ہیں۔ وہ بڑبڑایا۔

کھیت ہوا سے لہرا رہے تھے اور کسان ہاتھوں میں درانتی لیے ٹانگیں چوڑی کیسے سر جھکائے کام کر رہے تھے اور ہنسی مذاق بھی جاری تھا۔ وہ گا بھی رہے تھے اور ان کی توانا آوازوں میں گیت کھیتوں میں مچل رہے تھے۔ آخر یہ اس قدر زیادہ گاتے کیوں ہیں؟ اس نے خود سے پوچھا اور اس کے اندر غصے کی آگ بھڑکنے لگی۔

شام کی نماز کے موقع پر مجید نے اپنی آنکھیں بند کیں اور منادی کی۔ ''ہمیں ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ صرف خدا ہی ہے جو ہمیں کھانے کو دیتا اور ہماری پرورش کرتا ہے۔ قرآن میں لکھا ہے۔ اے مریم! تمہیں یہ روٹی کہاں سے ملتی ہے۔ اس نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ سے۔ اللہ جسے چاہے نوازتا ہے اللہ رحیم و کریم ہے''۔

لوگ خاموشی سے سنتے رہے۔ اب اس خاموش اور پراسرار مزار کا قرب ان پر

ہیبت بن کر چھا چکا تھا۔

وہ پھر کہنے لگا۔ ''خدا جس نے جنت، سورج، چاند اور ستارے تخلیق کیے ہیں وہی ہمیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ ہم اور ہمارے بچے زندہ رہیں کہ ہم اس کی خوبصورت تخلیق کی تعریف کریں۔ اس کی حمد کریں۔ اس کی طاقت اور فیاضی کا شکر ادا کریں۔ ہمیں روٹی دینے والی زمین بھی اسی کی تخلیق ہے۔ اللہ نے تمہیں مٹی سے بنایا اور حقیر سے قطرے سے۔ پھر تمہارے جوڑے بنائے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں مٹا کر ایک اور دنیا بنا دے۔ اللہ قادر مطلق ہے۔''

مجید نے انہیں خبردار کیا ''اور تم میں سے وہ جو اس لیے زمین کی پوجا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں کھانے کو دیتی ہے، وہ مشرک ہیں بتوں کو پوجنے والے سب سے بڑے گناہ گار ہیں۔ انہیں جہنم کی خوفناک بھڑکتی آگ میں پھینکا جائے گا۔''

ہوا کا جھونکا آیا اور دنیا کی روشنی نمٹانے لگی۔ چپ سادھے لوگوں کے سائے ڈگمگانے لگے۔ مجید نے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں، گردوپیش کا جائزہ لیا اور پھر اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے کہنے لگا ''جو اس دنیا میں خدا کو بھول کر ہنستے اور گاتے ہیں، وہ دوسری دنیا میں ہنسی کو ترسیں گے۔ بے ایمانوں پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔ ان کا انجام عبرتناک ہوگا۔''

لیکن خدا مہربان ہے۔ ''آنسو بھری آنکھوں سے اس نے بات آگے بڑھائی ''میرے بھائیو اس سے مدد مانگو۔ اس سے دور نہ رہو۔''

وقت گزرتا گیا۔ مزار پر ہجوم بڑھتا گیا۔ گاؤں گاؤں نگر نگر اس کی شہرت پھیل گئی عورتیں بچے اور مرد وہاں حاضری دینے لگے۔ ان میں سے بعض جلتی دھوپ میں میلوں کا سفر طے کر کے آتے اور دکھ اور بیماری کی داستانیں ساتھ لاتے۔ وہ جھکتے سجدے کرتے، واویلا کرتے، سرگوشیاں کرتے اور کبھی چپ سادھے رکھتے۔ ہر کوئی اپنے انداز میں اس شخص سے مدد کا طلب گار رہتا جو اب سجی سجائی قبر میں محوِ خواب تھا۔ جن کی جیب میں کچھ ہوتا وہ نذرانہ ادا کرتے اور بعض ڈیڑھ دو وقت کا فاقہ کر ڈالتے کہ کسی طرح نذرانے کے چند سکّوں کی بچت ہو جائے۔ مزار پر کھنکھناتے سکّوں کی بارش ہوتی رہتی۔ بھاری سکّے (.....) سکّے کہ کچھ کھرے ہوتے کچھ جعلی ہوتے۔ دن رات سکّوں کے انبار لگتے رہتے۔ ساتھ میں غم زدوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہوتی رہتی۔

باب نمبر 4

مزار کے ساتھ مجید نے اپنے لیے ٹین کی چھت والا لکڑی اور بانس کا چھوٹا سا گھر بنا لیا۔ اب چونکہ اس کے من میں ایک بیوی کی خواہش بھی مچلنے لگی تھی۔ سو اس نے تھوڑے سے فاصلے پر بیوی کے لیے لئے بھی ایک یا دوسرے لفظوں میں زنان خانہ بنا لیا اور اس کے چاروں طرف بانس کی دیوار بنا دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اناج جمع کرنے کے لئے کوٹھڑی بنائی۔ اب اس نے فصل اگانے کے لئے تھوڑی سی زمین خرید لی تھی۔ آخر میں اس نے مویشیوں کے چارے کے طور پر دھان کے ڈنٹھل جمع کرنے کی خاطر ایک گودام اور دودھ دینے والی گایوں کے لیے ایک چھپر تعمیر کیا۔ یہ گائیں اس نے مٹی گنج کے قریب لگنے والے جمعراتی بازار سے سستے داموں خریدی تھیں۔

اسے پوری طرح احساس تھا کہ اس کی نئی زندگی ایک خوش گوار مستقبل کے آثار رکھتی ہے۔ یہ نئی زندگی کسی نامعلوم شخص کی ایسی قبر کی مرہون منت ہے جو اب ایک مزار کا روپ دھار چکی ہے اور جس کے گرد موم بتیاں اور اگر بتیاں روشن رہتی ہیں۔ لیکن پہلی رات کا خوف اب بھی اس کے دل سے نہ نکلا تھا۔ کیا اس نئی زندگی کا سارا دارومدار بہت ہی کمزور بنیادوں پر نہیں؟ کیا یہ کاغذ کا ایسا گھر نہیں جسے ہوا کا کوئی ہلکا سا جھونکا بھی برباد کر سکتا ہے؟ جب یہ خیالات زیادہ ستاتے تو وہ گڑگڑا کر خدا کے آگے جھک جاتا۔ اسے امید تھی کہ خدا اس کے جھوٹ کو معاف کر دے گا۔ وہ اپنے آپ کو دِلا سے دیتا کہ خدا کا کرم لامحدود اور ابدی ہے۔ کیا خدا کے رسول نے یہ بات نہ کہی تھی؟ پھر بھی کبھی کبھی یہ سارے دلاسے ٹوٹ جاتے اور وہ خوف سے کانپنے لگتا۔ ایسے میں اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر وہ اپنے گھر میں گزارے ہوئے پرانے بھوک اور فاقہ کشی کے دن یاد کرتا۔ اسے گھاڑو پہاڑیوں میں گزارے ہوئے برس بھی یاد آتے جو اس کے موجودہ دعوؤں کے باوجود دکھ

اور تکلیف کے برس تھے۔

پھر مجید نے بیاہ بھی کر لیا۔ کچھ دنوں سے ایک لمبی تڑنگی بھاری بھرکم عورت پر اس کی نظر تھی۔ وہ بیوہ تھی لیکن جواں سال اور بے اولاد تھی۔ اس کے چوڑے چکلے جسم میں ایک ایسا حسن تھا۔ جس میں جنسی کشش بہت تھی کہ جسے دور سے بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ مجید نے بھی اسے ایک بار چند لمحوں کے لیے دور ہی سے دیکھا تھا، لیکن ناتواں مجید میں اس کے حصول کی خواہش نے جنم لیا۔ یہ خواہش اس کے اندر پلتی رہی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس سے شادی کر لی جائے۔ سوچتا رہا سوچتا رہا، اور آخر ایک دن اسے بیوی بنا کر اپنے گھر لے آیا۔

رحیمہ لمبی چوڑی تھی۔ اس کے کولھے بھاری اور پستان بڑے بڑے تھے۔ جلد ہی مجید کو احساس ہو گیا کہ وہ خالی بھاری بھرکم ہی نہیں بلکہ توانا بھی ہے۔ وہ آسانی سے بڑا بوجھ اٹھا لیتی اور اڑی ہوئی گائے کو زیادہ دشواری کے بغیر باڑھے سے کھینچ لاتی۔ لیکن اس کا جسم.....اس بھرپور جسم نے پہلے پہل مجید میں خواہش کی آگ بھڑکائی تھی۔ نرم و نازک تھا اور وہ خود بھی نرم خو تھی۔ جیسے اسے کبھی غصہ نہ آیا ہو۔ مجید کے لیے اس کے دل میں اندر ہی اندر احترام کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس میں کچھ خوف بھی شامل تھا۔ ہوتا بھی کیوں نہ کہ اس کے پیچھے اس مزار کا بڑا سایہ تھا۔ جہاں آ کر لوگ روتے، دعائیں مانگتے، التجائیں کرتے اور اگر بتیاں جلاتے تھے۔

ایک روز وہ صحن میں اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف تھی۔ مجید نے ایک پل کے لیے اسے خاموشی سے دیکھا پھر ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنا سر ہلایا اور کہنے لگا ''اس طرح نہ چلا کرو بی بی''۔

رحیمہ یکدم رک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں تمہیں یوں نہیں چلنا چاہیے۔ اس سے زمین کو تکلیف پہنچتی ہے۔ زمین کو یہ انداز پسند نہیں۔ اس میں توہین کا ایک پہلو ہے۔ اس سے وہ ناراض ہو جائے گی اور یاد رکھو کہ ایک نہ ایک دن سب کو اسی زمین کی آغوش میں جانا ہے۔'' ایک پل کے لیے مجید رکا اور پھر کہنے لگا ''اس طرح چلنا گناہ ہے''۔

رحیمہ پہلے بھی یہ سن چکی تھی۔ گھر میں اس کے بزرگوں، والدین اور عزیزوں نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن اب مجید نے یہی کچھ کہا تو اس کی آنکھوں میں سرخ کپڑے سے

ڈھکی ہوئی قبر گھومنے لگی اور وہ خوف زدہ ہوگئی۔

مجید نے جو اسے مسلسل گھور رہا تھا۔ رحیمہ کی آنکھوں میں خوف کی جھلک دیکھ لی۔ وہ مسکرایا۔ پھر کہنے لگا ''یوں نہ چلا کرو ورنہ جب تم زمین کی آغوش میں واپس جاؤ گی تو وہ تمہیں سزا دے گی''۔

اس توانا عورت کی آنکھوں میں خوف کی جھلکیں دیکھ کر وہ مطمئن ہوگیا اور مزید کچھ کہے بغیر مزار کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں اس نے قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی اور تلاوت کا انداز دلکش تھا۔ گل یاسمین کی خوشبو کی طرح ہوا میں نغمگی تیرنے لگی۔

گھر کا کام کاج کرتے کرتے رحیمہ اکثر ٹھٹھک جاتی اور مجید کی مناجات سننے لگتی خدا کی پراسرار دنیا اس پر آزادگی کے ایک پردے میں ظاہر ہوتی تھی جسے مجید کی تلاوت دور نہ کر سکتی تھی۔ مجید کی آواز تو اس کی روح کی گہرائیوں سے ایک ایسے اجنبی اور ناقابلِ فہم جذبے کو جنم دیتی جو اس کے پورے وجود کو گرفت میں لے لیتا۔ خدا، مزار اور مجید کا پراسرار خوف اس کے اندر سرسرانے لگتا۔

ایک روز اپنی چار دیواری کے قریبی حوض میں نہانے کے بعد رحیمہ صحن میں کھڑی تھی۔ اس کی گیلی ساڑھی بدن سے چمٹی ہوئی تھی اور وہ اپنے لمبے سیاہ بال جھٹک کر خشک کر رہی تھی۔ چمکتی آنکھوں سے مجید نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ ہولے سے کھانس کر گلہ صاف کیا اور کہنے لگا ''نہ نہ..... بی بی''، تمہیں یوں بے حیائی کے ساتھ باہر کھلے میں اپنی نمائش نہیں کرنی چاہیے''۔

چونک کر رحیمہ نے ہاتھ سر سے نیچے کر لیے۔ ساڑھی کا پلو کس کر بازوؤں پر لپیٹا۔ کولھوں پر اسے ڈھیلا کیا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ لیکن وہاں تو صرف مجید تھا جو دروازے کے پاس بیٹھا ناریل کے بنے ہوئے حقے کے کش لگا رہا تھا۔ شرم سے وہ پانی پانی ہوگئی اور لپک کر گھر کے اندر چلی گئی۔

جب دور فاصلے پر گیدڑ شور مچاتے اور کتے بھونکتے اور بے کیف کھیتوں پر گہرا اندھیرا اتر آتا، تو پھر گھر کی تاریکی دھرتی کی سیاہی بن جاتی۔ ہر آواز، سانس لینے کی آواز، ہوا اور مٹی کے فرش پر چوہے کی بھاگ دوڑ سیاہ رات کے شور میں سما جاتی۔ رات اور اندھیرے کے سوا دنیا میں کچھ نہ رہتا۔ لیکن رحیمہ کے لئے رات کا مطلب مجید تھا اور

مجید خود رات سے بھی بڑھ کر تاریک تھا۔ لیٹنے سے پہلے وہ اس کے لیے اور اس کے بزرگوں کے لیے دعا کرتا، خود یہ دعائیں بھی ایک اندھیرا تھیں۔ ناقابل فہم، بدشگونی اور خوف کی کیفیت سے بھرپور جب وہ اسے دعائیں مانگتے سنتی تو اداس ہو جاتی اور کھوسی جاتی۔ جیسے کسی عظیم سمندر کے کنارے کوئی تنہا بچہ اداس اداس اور کھویا کھویا بھٹکتا پھر رہا ہو۔ یہ لامحدود سمندر اور اس کی بپھری ہوئی لہریں اسے بہا کر کہاں سے کہاں لے جائیں۔ خیر رحیمہ کے جسم سے لطف اندوز ہونے سے پہلے مجید یہی کچھ کرتا تھا۔ یوں جب وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹتا تو وہ خوف کی ماری اور سہمی ہوئی ہوتی۔ اس کی آنکھوں میں اور اس کے دل میں وہ رات کی مانند پھیل جاتا۔ رات جس سے خوف آتا ہے اور جس کا احترام بھی کیا جاتا ہے۔

کانپتی ہوئی آواز میں مجید کی سرگوشی سنائی دیتی ''تم میرے ساتھ نہیں ہو بی بی۔ تم یہاں نہیں ہو''۔

''مگر میں تو یہیں ہوں'' وہ کہنا چاہتی، لیکن کسی سہمے ہوئے بچے کی مانند زبان اس کا ساتھ نہ دیتی۔ سب کچھ خدا کے نام پر ہی ہوتا ہے۔ یہ معزز نام اب نہ صرف رات بلکہ تمام انسانی خواہشوں، محبتوں، نفرتوں اور خوف پر حاوی دکھائی دیتا۔

ایک رات اس نے سرگوشی کی'' تم صاف رہا کرو بی بی۔ خدا اپنی مخلوق کو صاف ستھرا دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اسے گندگی سے نفرت ہے۔ سمجھ گئی ہو ناں؟

مجید کو پتہ نہ چلا کہ وہ کبھی ہے یا نہیں کیونکہ اچانک اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کا مضبوط جسم خاموش ہچکیوں سے کانپنے لگا تھا۔

باہر گیدڑ رات کی خاموشی میں چلّا رہے تھے۔ قبر کے سرہانے اب بھی ایک چراغ جھلملا رہا تھا۔

باب نمبر 5

مردار کھانے والے گیدڑ کی رات کی چیخ و پکار سدا ایک سی رہتی ہے۔لیکن انسان کی آوازیں بدلتی رہتی ہیں۔کبھی ان میں نرمی ہوتی ہے۔کبھی سختی۔کبھی خوف اور کبھی خوشی۔

مجید کو شاید معلوم نہ تھا لیکن اس کی آواز کی اعصاب زدہ باریکی اب ختم ہو چکی تھی--سرما کی تین فصلوں کے بعد اب اس کی آواز میں خوف اور بے اعتمادی کا وہ نشان باقی نہ رہا تھا جس سے وہ کبھی کانپا کرتی تھی۔اب وہ ایک پُر اعتماد شخص تھا۔گاؤں میں ہر کوئی اس کا احترام کرتا تھا۔اس کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی تھی۔گاؤں والوں کو جب کبھی مسائل کا سامنا ہوتا تو وہ اس کے مشورے اور برکت کے طالب ہوتے۔جب کبھی بدقسمتی انہیں گھیر لیتی تو وہ اس سے خصوصی دعاؤں کی التجا کرتے۔اس نے مزید زمین خرید لی تھی اور بڑھتی ہوئی خوشحالی نے اسے گہرا اطمینان عطا کیا تھا۔گاؤں کا زمیندار خلیق اب اس کا دوست بن چکا تھا۔وہ مجید کی مدد کرنے اور اس کے مشوروں پر عمل کرنے کو ہر دم آمادہ رہتا تھا۔

خلیق نے ایک مکتب بنایا تھا۔گاؤں کے بچوں کی جماعت اس مکتب میں دین کے ابتدائی اصول سیکھتی تھی۔مجید کو اس بات کی بہت خوشی تھی۔اب وہ اس زندگی سے قربت محسوس کرتا تھا جس سے حالات نے اسے برگشتہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔بچوں کے قاعدے پڑھنے کی آواز سن کر اسے اپنے بچپن کی تلخ یادیں ستانے لگتیں۔ایک زمانے میں وہ بھی اپنی معصوم باریک آواز میں یہی قاعدے پڑھا کرتا تھا۔

''ہم نے بھی دین اسی طرح سیکھا تھا۔اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔اصل میں خدا کا نام بچے کو پہلے سانس کے ساتھ ہی لینا چاہیے۔پر یہ ممکن نہیں۔اس لیے جس قدر جلد ممکن ہو بچے کو دین سیکھانا چاہیے''۔مجید نے زمیندار کو بتایا۔لیکن اس نے بچپن کی افسردہ

یادوں میں کسی اور کو شریک نہیں کیا۔

مجید کا خیال تھا کہ جو شخص کسی مقصد کو لے کر کھڑا ہوا ہو، اسے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ ہر وقت اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا اور چوکنا رہتا۔ جب کوئی ناگوار بات ہوتی تو وہ فوراً دخل دیتا۔ وہ اکثر زور دے کر کہتا کہ ''میرے جیسا کوئی شخص آج کے کام کو کبھی کل پر نہیں ٹال سکتا۔ کیا خدا ہر لمحے ہمیں دیکھ نہیں رہا؟''

ایک روز اس نے بوڑھے شرمیلے دادو کو چھکڑے کے پاس بیٹھے حقہ پیتے دیکھا وہ اس کے پاس سے گزرا اور پھر پلٹ کر اس کے پاس آیا۔

''تمہیں کلمہ آتا ہے''۔

یوں بے خبری میں پکڑے جانے پر بوڑھے نے کندھے جھٹکے۔ سر کھجایا اور گھبراہٹ میں ہونے سے مسکرا دیا۔

''یوں دانت مت نکالو''۔ مجید گرجا۔

دادو کی مسکراہٹ یکدم غائب ہوگئی۔ ساتھ بیٹھا ہوا اس کا سات سالہ بچہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ بوڑھا باپ بندر جیسا دکھائی دے رہا ہے جس کا سر جھک گیا ہے اور کندھے ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔

''اوئے جاہل سانڈ'' مجید پھر سے گرجا ''تمہیں کلمہ بھی نہیں آتا۔'' بوڑھا کھڑا ہو کر آنکھیں جھپکانے لگا۔

''میں تو غریب آدمی ہوں۔ مجھے لکھنا پڑھنا کہاں آتا ہے'' اس نے عذر پیش کیا۔

''یہ تو کوئی بہانہ نہیں۔ کل سے تمہیں ضرور کلمہ سیکھنا چاہیے۔'' مجید نے حکم صادر کیا۔ حیران کن تیزی کے ساتھ بوڑھا تیار ہوگیا۔ مگر اس نے مجید پر ایک چور نظر بھی ڈالی۔ وہ بالکل احمق دکھائی دے رہا تھا۔ بظاہر اسے احساس تھا کہ جو کچھ وہ کہنے والا ہے، اس کا مجید سے کوئی تعلق نہیں۔

''میں غریب آدمی ہوں۔ بچوں کو کھلانے کے لیے میرے پاس کافی روٹی بھی نہیں ہے''۔

مجید نے سر ہلایا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس کی عادت ہی ہے۔ وہ اکثر اوقات بلاوجہ یہ جملہ دہرایا کرتا تھا۔ خیر بعض کے پاس کھانے کو بہت کچھ ہے اور بعض کے پاس نہیں ہے۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جاؤ اپنی راہ لو'' مجید بس یہی کہہ سکا۔

ایک اور دن مجید نے لڑکوں کے ایک گروہ کو امتحان میں ڈال دیا۔ اوئے کیا تمہارے ختنے ہونے ہیں؟'' اس نے ان سے پوچھا۔ لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، تعجب سے مسکرائے مگر زبان بند رکھی ''تمہاری زبانیں گنگ ہوگئی ہیں کیا؟''

تب ایک نے دوسرے موٹے تازے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے نہیں ہوئے ہیں.....''

شدید غیض وغصب کے انداز میں مجید چلّایا۔ ''اپنی لنگی اٹھاؤ'' موٹا لڑکا خاموش کھڑا رہا۔ اچانک مجید چیتے کی طرح اس پر جھپٹا اور اسے ننگا کر دیا۔

''میں آج ہی شام کو تمہارے ختنے کروں گا۔ اس نے بے رحمی سے اعلان کیا۔ موٹا لڑکا جس کی ٹھوڑی پر سبزہ نمودار ہو چکا تھا۔ خوف سے کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ ڈر سے پیلا پڑ گیا تھا۔

شام کی نماز کے بعد مجید نے اپنا سامان اکٹھا کیا۔ کپڑے کا ایک ٹکڑا۔ تھوڑا سا تیل، پتلے بانس کے دو ٹکڑے اور تیز دھار والا چاقو۔ موٹے لڑکے نے یہ سب کچھ دیکھا تو خوف سے چیخنے لگا۔ اس کا باپ بھی سہما ہوا تھا مگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس دوران سارا گاؤں یہ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ خلیق بھی یہ منظر دیکھنے کو نکلا تھا۔

مجید نے تیوری چڑھائی اور انہیں ملامت کرنے لگا۔ وہ چیخا ''جب تم شیطان کی طرح گاتے ہو اور شہوت میں آ کر عورتوں کو پٹ سن کے کھیتوں میں لئے جاتے ہو تو پھر تم خدا کے نام کا انکار کرتے ہو۔ اے رب العالمین''..... وہ چیخا..... ''ہمیں ان پاپی لوگوں سے بچا''۔

اس نے خلیق کو بھی نہ بخشا اور کہنے لگا کہ تمہارے گاؤں کے لوگ کافروں سے بھی بدتر ہیں''۔

لڑکا اپنی مصیبت میں چلاتا رہا۔ اس کا باپ بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اندر کا دکھ اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ اس اذیت کے عالم میں لڑکے نے خود کو بچانے کی شدید خواہش سے مغلوب ہو کر چلانا شروع کر دیا کہ اس کے باپ کے بھی ختنے نہیں ہوئے۔

ہجوم پر گہری خاموشی چھا گئی۔ مجید کی زبان بھی گویا بند ہوگئی تھی۔ آہستہ سے اس

نے خلیق کی طرف رخ کیا۔ جس کا منہ دکھ سے سرخ ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس شخص کے ختنے نہ ہونے کا ذمہ دار خلیق خود ہے۔

آدھے گھنٹے کے اندر باپ اور بیٹا دونوں کی باری آ گئی۔ مردوں کا ہجوم اس منظر سے لطف اندوز ہونے پر خوش تھا۔ سب لوگ ضرورت پڑنے پر مجید کی مدد کر رہے تھے۔ بانس کی دیوار کے پار عورتیں بھی یہ تماشا دیکھنے کو ٹھٹھک گئیں۔ حیرت کے مارے بچے اور جوان اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے لڑکے کے باپ جیسے کسی بڑے آدمی کو اس طرح خوف زدہ اور بچوں کی طرح روں روں کرتے نہ دیکھا تھا۔ اتنی عمر کے آدمی کے ختنے دیکھنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے کپڑے اتارے جا چکے تھے اور اب وہ بالکل برہنہ تھا۔ اس عالم میں وہ اس قدر مضحکہ خیز اور قابل رحم دکھائی دیتا تھا کہ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ رحیمہ بھی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اپنے شوہر کی اہمیت کا احساس کر کے اس کا چہرہ فخر سے دمکنے لگا۔ جب لڑکیاں ہنسنے لگیں تو اس کا بھی ان کے ساتھ مل کر ہنسنے کو جی چاہا لیکن وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اپنا منہ اس نے ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا تا کہ دوسرے لوگ دیکھ نہ سکیں۔

اس شام قبر کے کنارے اپنی معمول کی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد مجید خنک ہوا میں اکیلا کھڑا تھا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ دھندلے افق سے ستاروں کا جہاں نمایاں ہونے لگا تھا۔ گاوں پر خاموشی طاری تھی۔ دور کہیں کھیتوں میں ایک کتا بھونکنے لگا۔

تاروں بھری رات کی گہری خاموشی میں مجید کو اچانک قوت کے ایک احساس کا تجربہ ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے محبت پور میں اپنی جڑیں بہت گہری اور مضبوط بنا لی ہوں۔ اس کا درخت پھل پھول چکا تھا اور اس کی شاخیں سارے گاؤں پر چھا چکی تھیں۔ بلاشبہ خلیق کے اثر و رسوخ کو نظر انداز کرنا محال تھا لیکن اس کا اپنا اثر و رسوخ اس سے بھی زیادہ تھا۔ البتہ اس کی نوعیت مختلف تھی۔ اس سہ پہر کو موٹے لڑکے اور اس کے باپ کو مجید کے ہاتھوں خوف اور تکلیف برداشت کرنا پڑی تھی۔ لیکن لوگوں میں غصہ یا نفرت پیدا نہ ہوئی تھی۔ اگر خلیق اپنی دولت کے سہارے ان کے ساتھ یہی سلوک کرتا تو بھی شاید وہ اپنی زبانیں بند رکھتے۔ لیکن گاؤں کے سارے لوگ اس کے خلاف نفرت ضرور محسوس کرتے۔ مجید کی قوت اوپر سے لامعلوم کے خوف سے، اس قبر سے آتی تھی جس پر اب سرخ چادر پڑی ہوئی تھی۔

باب نمبر 6

مجید کی قوت کا سایہ رحیمہ پر بھی پڑ رہا تھا۔ اب کتنی بہت سی عورتیں اس کے پاس آنے لگی تھیں۔ رحیمہ گاؤں کی ہی لڑکی تھی۔ بچپن میں وہ چھوکروں کی طرح گاؤں کی گلیوں میں قلانچیں لگاتی پھرتی، درختوں پر چڑھتی یا ندیوں میں نہاتی اور وہ جو اس کی ناک میں چاندی کی نتھ چمکا کرتی تھی اس پر وہ کتنا ناز کرتی تھی۔ گاؤں کی عورتوں نے اسے جواں ہوتے، شادی کرتے اور پھر پہلے خاوند سے محروم ہوتے دیکھا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ زندگی کے اس حادثے کے بعد وہ کیسے شانت، نیک دل، سست اور بوجھل ہوگئی تھی۔ یہی عورتیں اب اس کے پاس آتیں تو انہیں رحیمہ کا ایک اور ہی روپ دکھائی دیتا۔ وہ آہستگی سے اس سے باتیں کرتیں اور اپنے لیے مجید سے سفارش کرنے کی التجا کرتیں۔ پچھلے دروازے سے وہ اندر آتیں، مسکینی سے بیٹھ جاتیں، احترام کے ساتھ رحیمہ سے بات کرتیں اور اس کے ہر لفظ کو نہایت غور سے سنتیں۔ جب دل بھر آتا تو بس خاموشی سے آنسو بہانے لگتیں۔ قبر سے اٹھنے والی پراسراریت نے اس گھر کو بھی گھیر رکھا تھا۔ عورتوں کو اس کا پوری طرح احساس تھا۔ رحیمہ جو کبھی گاؤں کا ماہی منڈا سمجھی جاتی تھی۔ اب اس کے گرد اسرار اور قوت کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔

یہ پیر کی قبر کے محافظ کی بیوی رحیمہ ہی تھی جو عورتوں کے دکھ مٹانے کے لیے مجید سے مدد کی التجا کر سکتی تھی۔ ان کی طرف سے صرف وہی رابطے کا کام دے سکتی تھی۔ اب وہ خدائی ارادے کے روبرو گاؤں کی عورتوں کی وکیل بن چکی تھی۔

عورتوں کی دکھ بھری داستانیں رحیمہ ہمیشہ توجہ سے سنتی۔ اکثر اوقات اس کا دل بھر آتا اور کبھی کبھی آنسو بھی آنکھوں سے بہنے لگتے۔ کبھی کبھی راتوں کو وہ احترام کے طور پر

ساڑھی کے پلو سے سر کو اچھی طرح ڈھانپ کر قبر کے پاس جا کھڑی ہوتی اور اس کے پیچ دار خطوط کا جائزہ لینے لگتی۔ لیکن اس سے اس کا اضطراب بڑھ جاتا اور اس کی خواہش کے برخلاف آنکھیں بند ہو جاتیں۔ اسے خدشہ ہوتا کہ کہیں انجانے میں وہ قبر میں چھپی ہوئی قوت کو ناراض نہ کر دے۔ تب وہ ذرا سا کانپنے لگتی۔ پھر بھی وہ کافی دیر تک خاموش اور بے حس و حرکت وہیں کھڑی رہتی۔ اسے یہ خیال ستاتا کہ آخر وہ عظیم انسان کون ہو سکتا ہے جو اس قبر میں پڑا سو رہا ہے۔ لیکن جو زندوں کے مصائب سے بے نیاز نہیں اور ان کی جھولی خوشیوں سے بھرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

کبھی کبھی رات کی گہرائیوں میں رحیمہ کے ہونٹوں پر اس کی اپنی خفیہ خواہش بھی مچلنے لگتی۔ وہ کہتی کہ میں بے اولاد ہوں۔ بچے کے بغیر میں اکیلی اور ادھوری ہوں۔ سوچتی کہ وہ تنومند عورت ہے اور کئی بچوں کو جنم دے سکتی ہے۔ کیا پیر اسے بچے دے گا۔ صرف ایک بچہ؟ جب وہ یہ التجا کرتی تو اس کی تشویش اور خواہش کی آگ صرف آنکھوں ہی سے ظاہر ہوتی تھی۔ پھر اس پر شرم کا احساس غالب آ جاتا۔ آخر وہ کیوں پردے میں پوشیدہ قوت کو اپنی ذاتی خواہش کی تسکین کے لیے تکلیف دینا چاہتی ہے۔

ایک روز وہ قبر کے سامنے خاموشی سے کھڑی تھی کہ ایک بگولے نے پرسکون ہوا میں ہلچل مچا دی۔ سرخ چادر کے کونے پھڑ پھڑانے لگے اور چراغ ٹمٹمانے لگے۔ ایسے میں خوف کی ایک لہر رحیمہ کی رگوں تک اتر گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس ابدی اندھیرے سے کوئی بھرپور آواز ابھرنے کو ہے۔ کوئی کچھ کہنے کو ہے۔ لیکن ہوا کا جھونکا غائب ہو گیا اور ہر شے پھر سے پہلے جیسی ہو گئی۔ اندھیرا اندھیرا ہی رہا۔ کوئی شعاع نمودار ہوئی نہ کوئی آواز سنائی دی۔

کسی رات کو رحیمہ صرف ان لوگوں کے لیے دعائیں کرتی جنہیں وہ جانتی تھی بلکہ ان کے لیے بھی جنہیں وہ جانتی نہ تھی۔ وہ خدایا سالو کے باپ کو سکھ دے۔ وہ عرصے سے اس خوفناک بیماری کا شکار ہے۔ پھر ہمارا کیتھانی بھی بخار سے ختم ہو رہا ہے۔ خدایا اس پر رحم کر۔ غریب قادر پر بھی کرم کر۔ اس کے بہت سے بچے ہیں اور کھانے کو ہمیشہ کم ہوتا ہے۔ ان پر مہربانی کر۔ مشرق میں بڑے دریا کے قریب رہنے والے لوگوں پر بھی ترس کھا۔ ابھی کل ہی خوفناک طوفان نے ان میں سے بہت سوں کو غرق کر دیا ہے وہ اچانک موت کے منہ میں چلے گئے۔ کیسی خوفناک موت انہیں آئی ہے۔ ان کی روحوں پر

رحم کر۔ان کی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں پر اپنی رحمت نازل کر‘‘

کبھی کبھی عورتیں عجیب وغریب خواہشیں لے کر رحیمہ کے پاس آئیں۔ایک روز طاہر اور قادر کی بیوہ بہن کلثوم اس کے پاس آئی اور کہنے لگی ’’میں نے تم سے ایک خاص بات کہنی ہے‘‘ رحیمہ نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

’’مہربانی کر کے اس سے کہو کہ میں مرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھے اس دنیا سے نجات دلا دے‘‘۔

رحیمہ ہولے سے مسکرادی۔

کیوں، پیاری آخر کیوں؟

’’اس لیے کہ اب میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی‘‘۔

رحیمہ اب بھی سنجیدہ نہ ہوئی تھی۔ کہنے لگی ’’اگر تم مر گئیں تو پھر تمہارے بیٹے کا کیا بنے گا؟‘‘

کلثوم کے لیے یہ کوئی پریشانی کی بات نہ تھی۔اس نے بس یہی جواب دیا کہ ’’اسے تم گود لے لوگی۔کیا نہیں؟‘‘

رحیمہ اپنے کومل انداز میں ہنسنے لگی۔وہ رضائی کاڑھ رہی تھی۔اس نے اپنی آنکھیں نیچی کیں اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

کلثوم ایک روز پھر آئی اور کہنے لگی ’’آج مجھے بہت خاص بات کرنی ہے‘‘۔

’’اچھا کیا بات ہے؟‘‘

’’پیر کو چاہیے کہ وہ خدا سے اس بڈھے جوڑے کو اٹھا لینے کو کہے‘‘۔

’’کون سا بڈھا جوڑا؟‘‘

’’میرے ماں باپ‘‘

رحیمہ نے ایسے جیسے اسے تعجب ہوا ہو کہا ’’بے وقوف یہ تم کیا کہہ رہی ہو‘‘ ’’میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔میں ان کی ہر وقت کی کھٹ پٹ سے تنگ آ گئی ہوں‘‘۔

اس کا باپ، تارا میاں، ایک لمبا سوکھا سڑا بوڑھا آدمی اور اس کی ماں چھوئی موئی سی تھی۔لیکن ان کے الفاظ زہریلے تیروں کی مانند تھے جو کسی اشتعال کے بغیر وہ ہر وقت ایک دوسرے پر پھینکتے رہتے تھے۔کبھی کبھی ان کا دنگا فساد اس قدر بڑھ جاتا کہ لگتا کہ صرف قتل و غارت ہی سے یہ معاملہ ختم ہوگا۔تارا میاں غصے سے پھنکارنے لگتا اور اچھل

اچھل کر بیوی کی طرف بڑھتا۔لیکن وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ جب تھک ہار کر وہ کونے میں دبک جاتا تو وہ سر کو جھٹکا دیتی اور اسے بزدلی کے طعنے دینے لگتی۔ کھٹ پٹ پھر سے شروع ہو جاتی۔ اگر وہ دوبارہ تھک ہار کر بیٹھ جاتا تو پھر وہ اپنا ترپ کا پتہ پھینکتی۔

''آ تشک پڑے بڈھے۔ کیا تو اب بھی کود کو میرے بچوں کا باپ سمجھتا ہے؟ احمق گدھے، تو ہیضے سے مرے۔ میری بات سن۔ میں خدا کی قسم کھاتی ہوں، تو ان بچوں کا باپ نہیں ہے''۔ یہ قصہ سناتے ہوئے کلثوم سٹپٹا کر ہنس پڑی اور شرم سے سرخ ہوتے اپنے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

جب بوڑھا آدمی بھاگتا ہوا طاہر اور قادر کے پاس آتا اور ان سے پوچھتا کہ آیا انہوں نے اپنی ماں کی بات سنی ہے تو وہ اسے برا بھلا کہتے اور بے نیازی سے جواب دیتے ''جہنم میں جاؤ تم دونوں''۔

لیکن جب وہ ڈنڈا لے کر بیوی کی طرف بڑھتا تو دونوں اس کی راہ روک لیتے۔اس بات سے بڈھے کو یقیناً خوشی ہوتی تھی۔

رحیمہ کلثوم کو پسند کرتی تھی۔ جب سے اس کا شوہر مرا تھا وہ اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی تھی۔ دھان کو صاف کر کے اور ایسے ہی دوسرے چھوٹے موٹے کام کر کے وہ روزی کماتی تھی کیونکہ اس کے ماں باپ اور نہ ہی بھائی اس کا اور اس کے پانچ سالہ بیٹے حسینی کا بوجھ اٹھانے کے قابل تھے۔ محنت مزدوری سے جو کچھ اسے ملتا اس پر خوش ہو جاتی۔ کبھی تھوڑے سے چاول، کبھی سبزیاں اور کبھی بچا کھچا کھانا اس کے حصے آتا۔ وہ خود کسی شے کی فرمائش نہ کرتی تھی۔ رحیمہ نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ ''یہ سارے لوگ تم سے محنت تو لیتے ہیں لیکن معاوضہ دینا اکثر بھول جاتے ہیں''۔ کلثوم نے اس پر مختصر جواب یہ دیا تھا کہ ''ان کی مرضی''

رحیمہ جانتی تھی کہ وہ مر جائے گی، بچے کو بھی مار دے گی مگر کسی سے مدد نہیں مانگے گی۔ رحیمہ نے ایک بار اس سے کہا ''تم اپنی سسرال کیوں نہیں جاتیں؟'' اس کا ایک ہی جواب تھا۔

''ہرگز نہیں''۔ اصل میں رحیمہ کو معلوم تھا کہ کلثوم کبھی وہاں نہ جائے گی کیونکہ ان کا بیٹا اور اس کا خاوند مر گیا تھا اور جانے کیا سبب تھا کہ خود کو اس کا مجرم گردانتی تھی۔

اب رحیمہ سنجیدہ ہو گئی اور کلثوم کو دلاسا دینے لگی۔

''ماں باپ کے لڑائی جھگڑے سے پریشان نہ ہوا کرو۔ میں اس سے تمہارے ماں باپ کے لئے دعا کرنے کو کہوں گی''۔

کلثوم جب مجید کے گھر سے نکلی تو اسے اپنے وجود میں تسکین کا ایک انوکھا احساس ہوا۔ اس قدر خوشی تو اسے فصل کٹنے کے دنوں میں بھی نہ ہوئی تھی۔ ان دنوں میں اس میں کیسی چمک آ جاتی تھی۔ گھر جا کر دھان صاف کرتی اور ذرا نہ تھکتی۔ بچپن میں جو اس نے ایک دھن سیکھی تھی۔ اس میں گنگناتی رہتی۔ گھر پہنچی تو اس کے بھائیوں نے فوراً ہی اس کی کیفیت کو بھانپ لیا۔

''کیا بات ہے تم شادی تو نہیں کر رہی ہو؟''

معمول کے مطابق اس کی ماں صحن میں بیٹھی تھی۔ اس نے منہ بسورتے ہوئے طعنہ دیا ''ایک خصم پہلے کھا چکی ہے۔ اب دوسرے کو بھی کھائے گی''۔

طاہر کو یہ بات خوب لگی۔ وہ پوچھنے لگا ''بھئی تم نے اسے کیسے کھایا تھا؟'' لیکن کلثوم کی خوشی کا کوئی حساب نہ تھا۔ برا منائے بغیر وہ نرمی سے کہنے لگی میں اسے ہڑپ کر گئی تھی''۔

ماں کی نظریں دوسری طرف تھیں کلثوم نے بڑا سا منہ کھول کر اشارہ کیا کہ کیسے وہ اسے ہڑپ کر گئی تھی۔

پھر اس نے بچے کو اٹھایا اور نہانے کی غرض سے تالاب کی طرف چلی گئی۔

سہ پہر روشن اور گرم تھی۔ اس نے پہلے بچے کو نہلایا۔ تولیے سے اسے خشک کیا اور پھر اسے کنارے پر بیٹھا کر تالاب میں گھس گئی۔ اس کے کندھوں تک پانی تھا۔ بھینس کی طرح وہ خاموشی سے پانی میں نہاتی رہی۔ اس خاموش سہ پہر کو جب کہ درخت اور گھاس سورج میں چمک رہے تھے اس نے یکدم کہا۔ ''میں خوش ہوں''۔

خوش ہوتی بھی کیوں نا؟ بالآخر کسی نے اس کے والدین کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ اسے اپنے دکھوں کی پروا نہ تھی۔ لیکن ماں باپ کے مصائب سے اسے بے حد رنج پہنچتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماں نے اپنی بے ہودہ کہانی اس کے باپ کو اذیت دینے کے لیے گھڑی تھی۔ انہیں تو اب ایک دوسرے سے نفرت ہی کرنی تھی کہ اب ان کے دلوں میں نفرت کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ خیر اب مجید ان کے لیے دعا کرے گا اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

تالاب پر چھائے ہوئے ایک درخت پر ہرے رنگ کا زرد پوٹے والا پرندہ آ بیٹھا۔ پرندے کو دیکھ کر اس کا دل مچل گیا اور جی بھر آیا۔ ''اتنا ننھا پرندہ اور اتنا خوبصورت ''۔ وہ بڑبڑائی۔ کتنی مشکل سے اس نے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ لیکن اس کی نظر اس پر نہیں گئی کہ اس خوبصورت پرندے کی تیز بے رحم نظریں مچھلی کی تاک میں پانی میں گڑ گئی تھیں۔

باب نمبر 7

دوسرے روز مجید نے بڈھے کو بلا بھیجا۔ ''یہ تمہاری بیوی کیا کہتی رہتی ہے؟ اس نے صاف صاف پوچھ لیا۔

بڈھا ایک پل کے لئے ہچکچایا اپنی آواز صاف کی اور کہنے لگا ''جناب کچھ بھی نہیں''۔

''بتاؤ مجھے'' مجید گرجا ''وہ کیا کہتی پھرتی ہے''؟

''میں نے کہا نا کچھ بھی نہیں''۔ بڈھا مجید پر نظریں گاڑے خاموشی سے وہاں کھڑا رہا۔ مجید نے جواب میں غصے بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ جاؤ''۔

لیکن بڈھا اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ مجید نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

''ہاں؟''

''تم نے یہ بات کہاں سے سنی ہے؟'' بڈھے نے پوچھ ہی لیا۔

''کہیں سے نہیں۔'' مجید نے ٹکا سا جواب دیا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ اس سہ پہر کلثوم اپنے بچے کے ساتھ مجید کے گھر آئی۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ مجید آرام کر رہا تھا اور رحیمہ دروازے کے پاس بیٹھی رضائی پر کام کر رہی تھی۔

عموماً مجید کی موجودگی میں کلثوم نہیں آتی تھی لیکن اب وہ اس کی موجودگی کے باوجود کمرے میں داخل ہو کر رحیمہ کے پاس بیٹھ گی اور رونے لگی۔

باپ نے اسے بری طرح پیٹا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس نے گھر کی بات باہر کی تھی۔

مجید خاموش رہا۔مگر اس کے چہرے کا تاثر نہ بدلا۔لیکن اندر ہی اندر وہ غصے سے بل کھانے لگا۔''اس سے کہو چلا جائے'' اس نے رحیمہ سے کہا۔''اسے بتاؤ کہ مجھے غصہ آ رہا ہے۔''

جانے کے بجائے کلثوم نے رحیمہ سے سرگوشی کی۔جس نے مجید کو بتایا کہ وہ باپ کی وجہ سے گھر جانے سے خوف زدہ ہے۔

مجید نے اسے دیکھا۔اب وہ رو نہیں رہی تھی۔مجید کی طرف اس کی پشت تھی یونہی توجہ ہٹانے کو وہ اس چٹائی کو نوچنے لگی جس پر وہ بیٹھی تھی۔

''ٹھیک ہے پھر اسے یہیں رہنے دو'' مجید کی آواز سنائی دی۔

اس شام مجید نے گاؤں والوں کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا۔عام طور پر شام کی نماز کے وقت اس کے پاس کم لوگ ہوا کرتے تھے لیکن اب اس نے ہر ایک کو آنے کی ہدایت کی۔ان میں گاؤں کے بڑے بوڑھے زمیندار خلیق اور تارا میاں بھی شامل تھے۔

بوڑھا آدھی ہجوم میں بظاہر لاتعلق ہو کر بیٹھا تھا۔اپنی بے نیازی کے اظہار کے لئے وہ بار بار سر کھجاتا اور حوصلہ مندی سے گرد و پیش نگاہیں دوڑاتا۔معمول کی عبادت کے بعد مجید نے اس کی طرف دھیان دیئے بغیر بھیڑ کی طرف رخ کیا۔

''شاید ہمیں اس کا ہمیشہ احساس نہ ہو اور شاید ہم تسلیم بھی نہ کریں، لیکن تقریباً ہم سب گناہ گار ہیں۔لیکن بعض زیادہ گناہ کرتے ہیں اور بعض کم۔بعض جانتے بوجھتے گناہ کی دلدل میں گھس جاتے ہیں اور بعض جانے بغیر گناہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔لیکن گناہ گناہ ہی ہوتا ہے'' گہری خاموشی میں وہ لمحہ بھر کے لئے رکا۔

''یہ اچھی بات ہی ہے کہ آدمی کو پتہ ہو کہ کب وہ گناہ کرتا ہے۔آج یہاں ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے جس نے شاید بے خبری میں گناہ کیا ہے۔پر خدا کا کہنا یہ ہے کہ جہالت خود سب سے بڑا گناہ ہے'' یکدم تارا میاں کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔''تمہاری بیوی تم سے کیا کہتی ہے؟ بوڑھے آدمی نے چاروں طرف اجتماع پر نگاہ دوڑائی اور بلند آواز سے کہنے لگا''تم اس.....

مجید نے پُرسکون لہجے میں اسے جواب دیا''خدا ہم سب کو معاف کرے۔کیونکہ ہم اپنے اعمال اور برتاؤ پر خود منصف نہیں ہیں۔لیکن اس شخص کی بیوی کہتی

ہے کہ یہ اس کے بچوں کا باپ نہیں ہے۔''

بوڑھے آدمی نے غضب ناک نظروں سے مجید کو دیکھا۔اس کی آنکھوں سے نفرت برس رہی تھی۔

''یہ سچ نہیں ہے۔تم میری بوڑھی عورت کو نہیں جانتے۔وہ تو مجھے دکھ دینے اور ستانے کو ایسی باتیں کہتی ہے؟''

مجید پُرسکون رہا۔قرآن کی ایک آیت پڑھنے سے پہلے اس نے چند لمحات خاموشی سے گزرنے دیے۔دوبارہ بوڑھے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے کہا.....''تو پھر تم اپنے آپ کو قصوروار کیوں سمجھتے ہو؟ اپنی بیوی کو اور اپنی بیوہ بیٹی کو پیٹتے ہو؟ اس کی پشت پر ابھی تک مار پیٹ کے نشان ہیں''۔

بوڑھے آدمی کے ہونٹ دوبارہ کانپنے لگے۔

''وہ میری بیٹی ہے۔میں اسے مار سکتا ہوں۔''اس نے اعلان کیا۔کسی خوف کے بغیر وہ مجید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہا تھا۔

بعد کی خاموشی میں مجید نے اردگرد دیکھا۔ہاتھ گھٹنوں پر رکھے۔دوبارہ اس نے بولنا شروع کیا۔اس کی آواز دور سے آتی محسوس ہوتی تھی اور اس میں رنج والم کا کوئی نامعلوم عنصر بھی شامل تھا۔

''بھائیو! انسان کبھی خدا کے کاموں کا بھید نہیں پا سکتا۔انسان خیر وشر کا مجموعہ ہے۔ہم فرشتے ہیں اور شیطان بھی۔گناہ گار ہیں اور معصوم بھی۔کسی کو برا کہنا بدی ہے۔بہت بڑی بدی ہے اور جانے بغیر بھی ایسا کرنا بدی ہے۔جو کوئی تہمت لگاتا اور غیبت کرتا ہے وہ گناہ گاہ ہے۔جو کوئی شیطان کی چالوں کو نہیں سمجھتا وہ آسانی سے اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔وہ خدا سے نہیں ڈرتا اور قابل رحم وجود بن جاتا ہے۔اس کے لئے نجات نہیں ہے۔میرے بھائیو! آدمی کی زبان خطرناک چیز ہے۔سانپ کی زبان زہریلی ہوتی ہے لیکن آدمی کی زبان سب سے زہریلے سانپ سے بھی زیادہ زہریلی ہوتی ہے۔وہ خاندانوں کو خوشیوں کو اور ہر اس شے کو برباد کر سکتی ہے جو اس دھرتی پر خوبصورت اور اچھی ہے۔''

؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

تھا۔ شہد کی طرح اس کے الفاظ بہ رہے تھے اور سامعین کے دلوں میں اترتے جا رہے تھے۔ وہ ملائمت سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور گاؤں والوں کا جائزہ لیتا جو پوری توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''آدمی کی اسی بدکار زبان نے میرے دوستو.....اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا ایک بار ایک ایسی ہستی پر حملہ کیا تھا جیسی ہستی دوبارہ کبھی پیدا نہ ہوگی۔ ہجرت کے پانچویں سال جب ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ میں کامیابی کے بعد واپس آ رہے تھے تو ان کی جوان سال رفیقۂ حیات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کاروان سے بچھڑ گئیں۔ صحرا میں کوئی سڑک ہوتی ہے اور نہ ہی راستوں کے نشان ہوا کرتے ہیں وہاں کوئی بھی آسانی سے راہ بھول سکتا ہے۔ حضرت عائشہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا جن سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی محبت تھی۔ ایک نوجوان مجاہد کو وہ مل گئیں اور وہ انہیں حفاظت سے حضور کے پاس لے آیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے اونٹ پر بیٹھی تھیں اور وہ پیدل چل رہا تھا۔''

''لیکن'' مجید کہے جا رہا تھا.....''زہریلے سانپ پھن پھیلانے لگے۔ وہ سانپ جو لمبی گھاس کے بجائے ان عورتوں اور مردوں کے دل میں رہتے ہیں جو شیطان کی ترغیب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور شیطان کی اقلیم میں بدی اور مکر و فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایسے لوگوں کی زبانیں چلنے لگیں اور انہوں نے نبیؐ کی محبوب بیوی حضرت عائشہ کے بارے میں کینہ ور داستانیں مشہور کر دیں۔ ہمارے نبیؐ کو ان باتوں سے شدید رنج پہنچا اور انہوں نے خدا سے التجا کی۔ انہوں نے کہا کہ ''اے خدایا میری اس بیوی سے کیا خطا ہوئی ہے کہ لوگ اس طرح کی باتیں بنانے لگے ہیں'' ''تمہیں پتہ ہے کہ خدا کا جواب کیا تھا''؟

گاؤں کے لوگ سانس روکے منتظر تھے۔

مجید نے زبان ہونٹوں پر پھیری اور سورہ نور کی تلاوت کرنے لگا۔ اس کی آواز میٹھی اور اداس تھی۔ بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

مجید اچانک رک کر بوڑھے آدمی کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ پہلے سے کم سرکش اور گستاخ دکھائی دیتا تھا۔ جونہی مجید سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

سکتا۔قرآن کہتا ہے کہ خدا سب کچھ جانتا ہے اور انسان کچھ بھی نہیں جانتا۔وہ کسی کو زہر بھری اور کسی کو شہد جیسی میٹھی زبان عطا کرتا ہے کسی کو وہ گستاخ اور مغرور بنا دیتا ہے اور کسی کو فرمانبردار اور اطاعت شعار بنا دیتا ہے۔یقیناً اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔لیکن میرے بھائیو! ہر انسان کے لئے اس کے بال بچوں کی خوشی بہت اہم ہوتی ہے۔انسان انہیں زندہ رکھنے اور خوش رکھنے کے لئے بہت پاپڑ بیلتا ہے ہر مصیبت برداشت کرتا ہے۔انسان کو اس گھر سے زیادہ پیاری کوئی شے نہیں ہوتی جو وہ اپنے بچوں کے لئے بناتا ہے۔جو عورت اپنے ہی بچوں کے بارے میں غلط اور فریب کاری کی کہانیاں مشہور کر کے ایسے گھر کو توڑنا چاہتی ہے وہ خدا کی گستاخ ہے۔اور اگر جو کچھ وہ کہتی ہے وہ سچ ہے تو پھر وہ گناہ گار ہے۔اس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے اور اس کی سزا اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں دردناک ہوگی''۔

مجید کی آواز اب نرم اور ملائم نہ رہی تھی۔اس کی کرختگی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔بوڑھے کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے کہا۔''میں تم سے پوچھتا ہوں،تمہاری رائے کیا ہے؟ کیا تمہارے خیال میں جو کچھ وہ کہتی ہے وہ غلط ہے؟ کیا تم حلفیہ کہہ سکتے ہو کہ وہ غلط کہتی ہے؟''

تارا میاں نے ایک پل کو اسے دیکھا اور پھر نگاہیں پھیر لیں۔وہ تذبذب میں تھا کہ کیا جواب دے۔

بیتے ہوئے برسوں کے مناظر اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔اب وہ سب کچھ دور بہت دور رہ گیا تھا۔کتنے برس بیت گئے ہیں؟ برس ہا برس۔اب اسے کچھ یاد نہ تھا۔یہ اس سال کی بات ہے جب ہولناک قحط پڑا تھا۔اس زمانے میں وہ کس قدر جواں اور الھڑ تھی۔کیسے وہ ہر ایک کو چھیڑتی اور ہر ایک سے مذاق کرتی تھی۔پھر افواہ پھیل گئی۔وہ پکے رنگ کا نوجوان۔بوڑھا اب بھی اس کے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھ سکتا تھا لیکن وہ کہتی تھی کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔بس افواہ ہی ہے۔اور اس نے یقین کر لیا۔ہاں یہ بات ہرگز درست نہ ہو سکتی تھی۔وہ تو بس ایک مذاق ہی تھا۔

مجید بوڑھے آدمی کو خیالوں میں کھویا ہوا دیکھتا رہا اور پھر یکدم شیر کی مانند اس پر گرجا''بات کیا ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟ ہمیں بتاؤ۔کیا یہ سچ نہیں کہ تم نے دل میں کوئی بات چھپا رکھی ہے؟ کیا تم کچھ بھلانے یا اسے چھپانے کی کوشش نہیں کر رہے۔

یہ خاموشی جان لیوا تھی۔ مجید کو کوئی جواب نہ ملا۔ دوبارہ اس نے وہی سورت پڑھنی شروع کی۔ شروع میں اس کی آواز بے حد دھیمی اور ملائم تھی لیکن وہ بتدریج بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ سرکش موجوں کی طرح اردگرد کے لوگوں کے دل سے ٹکرانے لگی۔

حیران و پریشان تارا میاں اپنی جگہ گم سم تھا۔ اسے یہ یقین تھا کہ ان سارے برسوں میں وہ صرف اسے جلانے کی خاطر اس قسم کی باتیں کہتی ہے۔ اب اس کا اعتماد ڈھے گیا تھا۔ آخر اس نے گلا صاف کیا اور گردوپیش کا جائزہ لیا۔ مجید نے تلاوت بند کر دی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ پتہ نہیں مجھے کیا کہنا چاہیے۔''

''کیا تم کچھ چھپا رہے ہو؟''

بے چینی سے تارا میاں پہلو بدلنے لگا۔ مجید ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر طنزیہ انداز میں کہنے لگا ''کوئی شخص بھی تمہاری بیٹی کی پشت کے نشانوں میں جواب تلاش کر سکتا ہے۔

لوگوں پر بے چین کر دینے والی خاموشی طاری تھی۔ کسی کو بھی پوری طرح معلوم نہ تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اگلے منظر کے اشتیاق میں دم سادھے بیٹھے تھے۔ انہیں بوڑھے پر کوئی ترس نہ آ رہا تھا جو اب شکست اور یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ شاید اسے اسی حالت میں دیکھ کر ان کے دل میں ایک قسم کی نفرت پیدا ہونے لگی تھی انہوں نے سوچا کہ اس نے گناہ کیا ہے اور اب اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ کیا جہنم کے شعلے ابھی سے اس کے دامن تک پہنچنے لگے تھے؟

ایک بار پھر مجید نے آنکھیں بند کر لیں اور فضا میں تلاوت کرتی ہوئی اس کی سندر میٹھی آواز تیرنے لگی۔ نرم و گداز ندی کی طرح اس میں زیر و بم پیدا ہو رہے تھے۔ تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

''اپنے کرم کی بدولت خدا نے انسانوں کو خبردار بھی کیا ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں کہا کہ بری عورتیں برے مردوں کے لئے ہیں اور برے مرد بری عورتوں کے لئے ہیں۔ نیک عورتیں نیک مردوں کے لئے اور نیک مرد نیک عورتوں کے لئے ہیں۔ ان کے لئے خدا کے رحم و کرم کی کوئی حد نہیں۔ وہ مغرور جھگڑالو بوڑھا اچانک پھٹ پڑا۔

؟؟؟؟؟؟؟؟

تھا۔ کس درد کے ساتھ وہ رو رہا تھا۔ اس کی ہر سسکی دل کی گہرائیوں سے ابھرتی محسوس

ہوتی تھی۔ وہ گہرائیاں جن میں برسوں کی محرومیاں دکھ، مایوسی اور خود رحمی کے کچلے ہوئے جذبے جمع تھے۔ کسی نے اس کو نہیں روکا۔ مجید تسبیح پڑھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس کا چہرہ پھر سے پرسکون تھا۔

آہستہ آہستہ بوڑھے نے خود پر قابو پایا۔ مجید جب دوبارہ بولا تو اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔

''خدا رحیم و کریم ہے۔ وہی انصاف کرنے والا ہے۔ وہی معاف کرنے والا ہے۔ نہ تم نہ میں۔ بڑے میاں اب گھر جاؤ اور خدا سے دعا کرو۔ اپنی بڑھیا سے بھی دعا میں شامل ہونے کو کہو۔ خدا سے معافی مانگو۔ دعا کرو کہ وہ تمہیں سکون عطا فرمائے۔ بیٹی سے کہو کہ وہ بھی تمہیں معاف کر دے۔ اور مزار پر پانچ پیسے کا چڑھاوا دو۔''

کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کر بوڑھا جلدی سے آگے بڑھا اور مجید کے آگے جھک کر اس کے پاؤں چوم لئے۔

لیکن گھر واپس آنے پر اس نے نہ تو دعا کی اور نہ ہی کلثوم سے معافی مانگی۔ دو روز تک کچھ کھائے پیئے بغیر وہ اپنے گھاس پھوس کے بستر پر بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ ''جا کر دیکھو وہ ابھی مرا ہے یا نہیں'' اس کی بیوی گردن اٹھا کر چلا رہی تھی ''ہاں ہاں دیکھو اس کی قبر کھودنے کا وقت ہوا ہے یا نہیں''۔

''بابا کچھ کھاؤ گے نہیں؟'' کلثوم نے احساسِ جرم سے بوجھل آواز میں اپنے باپ سے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

اس کے بستر پر پڑنے کے دو روز بعد گاؤں میں شدید طوفان آیا۔ گرد آلود میدانوں سے بگولے اٹھ رہے تھے اور عقابوں کی طرح جھپٹ رہے تھے۔ طوفان ایسے سرکش بپھرے ہوئے ہاتھی کی طرح تھا جو بڑے سے بڑے درخت کو بھی ہلا ڈالتا ہے۔

جب بھی طوفان آتا تھا کلثوم بدحواس ہو کر چیختی چلاتی ادھر ادھر بھاگا کرتی تھی حسینی کہاں ہے۔ میرا چاند حسینی کہاں ہے؟ بکری کدھر ہے سفید گردن والی بکری؟ سرخ پروں والا مرغ کہاں گیا؟ بدحواسی کے عالم میں وہ پاگلوں کی طرح بے مقصد چکر کھاتی تھی اس کا جسم اچانک وحشیانہ جذبے سے ناچنے لگتا جس میں خوف اور سرور دونوں گڈمڈ بھی کرتا تھا۔

ہوا کا طوفان تھما اور شدید بارش شروع ہوگئی۔ لیکن اس بار کلثوم کو وہ مرغی نہ ملی جو خوب انڈے دیتی تھی۔ کلثوم نے پچھواڑے کی جھاڑیوں میں ہر جگہ اسے تلاش کیا۔ مرغی جیسی آوازیں نکالتی وہ آم کے درخت پر بھی اسے تلاش کرتی رہی۔ مگر اس کا کوئی نشان نہ ملا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ شاید وہ بوڑھے کے بستر کے آس پاس نہ چھپ گئی ہو وہ اس کے کمرے میں گئی۔ اندر اندھیرا تھا اور بارش کا پانی چھت سے ٹپکنے لگا تھا۔ وہ رک گئی۔ اچانک اس کا جوش ختم ہوگیا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے بوڑھے آدمی کو بے آرام کرنا چاہیئے کہ نہیں۔ غیر متوقع طور پر اس کی کمزور مگر صاف اور پُرعزم آواز سنائی دی۔ ''بیٹی مجھے تھوڑے سے چاول دو۔''

کلثوم بھاگی بھاگی گئی اور تھوڑے پکے چاول اور راب لاکر اس کے سامنے رکھ دی۔ بوڑھا لپڑ جھپڑا سے ہڑپ کر گیا۔

''مجھے تھوڑا سا پانی لا دو''

وہ لپک جھپک کر پانی لے آئی۔ اس کا جسم پانی سے بھیگ چکا تھا اور اس کی مہین سیاہ حاشیے والی ساڑھی جسم سے چمٹ کر رہ گئی تھی لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی اسے ایک اداسی نے آلیا تھا۔ بوڑھے کے لئے اس کے ہاں محبت کا ایک جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی دھڑکن، ایک کسک ہو رہی تھی۔

''اور چاول لاؤں بابا؟''

''نہیں'' اس نے خاموشی سے لیٹتے ہوئے کہا۔ چھوٹی سی کٹیا بارش سے کراہنے لگی تھی۔ بیٹی تھوڑے سے فاصلے پر خاموش کھڑی تھی۔ وہ پھر بولا۔ کہنے لگا۔

''بیٹی'' تم مجھے معاف کر دو۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ اب خود پر مجھے قابو نہیں رہتا۔ کسی بات کی سمجھ بھی نہیں رہی۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مجھے تم سے معافی مانگنی چاہیے''۔

وہ کیا جواب دیتی۔ یونہی بت بنی کھڑی رہی۔

''ہاں بیٹی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمھارے بھائیوں سے بھی معافی مانگتا ہوں۔'' کلثوم کو اس بات کی خوشی تھی کہ باپ نے کچھ کھایا ہے اور دوبارہ اس سے بولنے پر آمادہ ہے۔ اس بات کی پروا نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن وہ جواب دیے۔

''بابا کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہیں کیوں ہم سے معافی مانگنی چاہیے؟''

''اس لئے کہ اگر چہ میں تمہارا باپ ہوں، لیکن مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کچھ بھی پتہ نہیں۔''

طوفان ختم ہوا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چاول اور راب کھا کر اس میں جان آ گئی تھی۔ وہ تنگ و تاریک کوٹھری سے نکلا اور صحن کے پار چلا گیا۔ دروازے کے پاس بیٹھی ہوئی بیوی نے اسے دیکھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے مگر اسے اپنی منزل کا پتہ تھا۔

مجید اس لمبے لاغر بوڑھے کو اپنے گھر کے پاس دیکھ کر حیران ہوا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ جیسے وہ دعا مانگ رہا ہو۔

''کیا چاہتے ہو؟''

وہ کچھ بڑبڑایا۔ لیکن مجید کے پلے کچھ نہ پڑا۔

''بتاؤ مجھے، تم کیا چاہتے ہو؟'' مجید کی آواز میں چڑچڑاپن تھا اور اس میں خوف کی ایک لہر بھی شامل تھی۔

بوڑھا بیٹھی ہوئی آواز میں کہنے لگا ''میں یہاں مزار کے پاس بیٹھنے کی اجازت چاہتا ہوں''۔

یوں تارا میاں قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ روٹی پانی کو ہاتھ لگائے بغیر وہ تین دن اور تین راتیں یونہی قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا ہے اور اب اسے کسی غذا کی حاجت نہیں ہے۔ لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لئے آتے لیکن وہ ان کی موجودگی سے قطعی بے نیاز تھا۔ کوئی شخص یہاں تک کہ اس کی بیٹی اور بیٹے بھی اسے چھونے کی جرأت نہ کر سکے۔

چاندی کے فیتے سے لیس سرخ کپڑے سے ڈھکی ہوئی قبر کے کنارے یونہی بیٹھے بیٹھے ہوا اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ یہ تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آیا مرنے سے پہلے اس نے کوئی گیان حاصل کیا تھا یا نہیں لیکن مرد اور عورتیں سب کے سب اس عجیب و غریب انداز سے متاثر ضرور ہوئے تھے جو اس نے مرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ بعض لوگ تو رونے بھی لگے تھے۔

گہری عاجزی کے احساس کے ساتھ مجید نے کلثوم کو تسکین دی۔ ''ہم فانی لوگ اس کی کیا باتیں ہوئیں۔ جانے پیر نے اسے کیا برکت اور نعمت عطا کی ہوگی؟''

یہ سننے پر لوگ اپنی بے خبری کی اذیت محسوس کر کے رونے لگے۔

کئی دنوں تک مجید بجھا بجھا سا رہا۔ بوڑھے آدمی کی موت نے اسے اندر سے ہلا دیا تھا۔ اس قبر سے جس کے بھید کو صرف وہی جانتا تھا اس نے کبھی خوف محسوس نہیں کیا تھا لیکن اب پہلی بار وہ یہ سوچ کر ڈرا کہ اس نے اس قبر کو کیا بنا دیا ہے۔ قبر کی برباد کرنے والی قوت سے اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ کیا ایک روز وہ اسے بھی برباد کر دے گی؟ کئی روز تک وہ اپنے کمرے میں اکیلا گڑگڑا کر دعائیں کرتا رہا۔ باہر۔ قبر کے کنارے وہ خاموش رہا۔

لیکن یہ خوف دیرپا نہیں تھا۔ ایک روشن صبح جب وہ گھر سے نکل کر باہر دھوپ میں آیا تو اس نے محسوس کیا کہ خوف ختم ہو چکا ہے۔

باب نمبر 8

کئی دنوں تک مجید کے گھر میں بڑی چہل پہل رہی۔ کٹائی کے بعد کام بڑھ ہی جاتا ہے۔ اناج کو پھیلانا ہوتا ہے۔ دھان کو صاف کرنا ہوتا ہے اور چاولوں کو ٹھکانے لگانا ہوتا ہے۔ رحیمہ نے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے دو عورتوں کو ساتھ ملا لیا تھا۔ ان میں ایک کلثوم تھی اور دوسری ایک بوڑھی کبڑی عورت تھی جو جسمانی نقص کے باوجود جوانوں کی طرح لپک چھپک کام کرتی تھی۔

سرما کی آمد آمد تھی۔ شمال کی طرف سے کھیتوں میں سرد ہوا چلنے لگی تھی جو اب چٹیل میدان بنے ہوئے تھے۔ صحن میں عورتیں آگ جلا کر چاول ابال رہی تھیں۔ چاول کی ہنڈیوں میں سے ایک سنسناہٹ کے ساتھ بھاپ نکل رہی تھی۔ چٹختے انگاروں سے شعلے ابھر رہے تھے، شعلوں کی لال لال روشنی میں جس سے پورا احاطہ دمک رہا تھا سائے رقص کر رہے تھے۔

مجید نے ایک نظر انہیں دیکھا اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر سونے کے لیے چلا گیا۔ اس نے رضائی اپنے اوپر تان لی اور اسے گرمائی اور سکون کا احساس ہونے لگا۔ باہر آگ اب بھی پھنکار رہی تھی۔ بار بار ابلتے ہوئے چاولوں کی مہک اس تک پہنچتی۔ وہ اس میں گہرا سانس لیتا۔ یہ خوشبو اسے ہمیشہ اچھی لگتی تھی۔ بالآخر اطمینان اور مسرت کے احساس میں ڈوبا وہ خوابوں کی وادی میں کھو گیا۔

آدھی رات گزر چکی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ صحن سے آگ کے چٹخنے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایک پل کو اسے یوں لگا جیسے ہزاروں غضب ناک اور خبیث ناگ کمرے کی دیواروں پر رینگ رہے ہوں ابلتے ہوئے چاولوں کی میٹھی باس جانے کہاں کھو گئی تھی۔ ہوا کا بھی نام و نشان نہ تھا۔

مجید اٹھ کر باہر گیا۔ رات کی ٹھنڈی ہوا میں وہ کانپ رہا تھا۔ اسے عجیب سا احساس ہوا کہ جیسے اچانک لمحے بکھر گئے ہوں اور جیسے ان کی حدت میں اس کا دم گھٹنے لگا ہو۔ گھر کی بنیاد کے ساتھ تنگ سے چھجے پر بیٹھ کر اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی اس نے رحیمہ بوڑھی کبڑی عورت اور آخر میں کلثوم کو دیکھا۔ اب وہ کلثوم کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ آگ کی روشنی میں اس کی ننگی پیٹھ اور برہنہ بازو بے حد ملائم اور گداز دکھائی دے رہے تھے۔ دن کی روشنی میں گندی اور داغ دھبوں سے بھری دکھائی دینے والی اس کی سیاہ حاشیے والی ساڑھی ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ جب وہ حرکت کرتی اور آگ کے سامنے آجاتی تو اس کا جسم لہراتا ہوا دکھائی دیتا۔

مجید نے رحیمہ کو بلایا اس کی آواز بلند نہ تھی۔ لیکن اس میں ایک قطعیت ضرور تھی..... آواز جس کی نافرمانی محال ہو گویا جس شخص کی وہ آواز تھی اس سے عظیم تر اور زیادہ قوت والا اور کوئی نہ تھا۔ لہکتے شعلوں کے اوپر گہرا اور وسیع آسمان تھا وہ اس چھوٹے سے صحن سے بالکل بے نیاز تھا جس میں چاول ابالے جا رہے تھے۔ خدا کی دنیا اور انسان کی دنیا ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھیں۔

مجید نے رحیمہ کو صرف ایک آواز دی اور پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ جونہی رحیمہ اندر داخل ہوئی اس نے کہا۔

''کیا تم میری ٹانگیں دباؤ گی؟''

رحیمہ ہچکچائی۔ کم و بیش ہر رات ہی وہ اس کی ٹانگیں دبایا کرتی تھی جو دن گزرنے کے بعد اکثر تھک جاتیں اور درد کرنے لگتیں۔ لیکن آج رحیمہ جانتی تھی کہ وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔ کچھ کہے بنا وہ اندھیرے میں کھڑی رہی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ بے خیالی میں اس نے ہاتھ پونچھے۔ پسینے سے بھرا ہوا منہ صاف کیا اور اپنا بھاری بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری پر منتقل کیا۔

مجید نے تھوڑا انتظار کیا۔ جب دیکھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں رہی ہے۔ تو کہا ''آ وَنا ذرا میری ٹانگیں دبا دو''۔ بوجھل آواز میں بالآخر رحیمہ نے کہہ ہی ڈالا ''ابھی بہت سا کام رہتا ہے صبح تک سارا کام مکمل کرنا ہے۔''

''پھر دیکھا جائے گا۔''

یہ الفاظ اگرچہ نرمی سے ادا کیے گئے تھے، لیکن حکم سے کم نہ تھے۔ اس شخص کا حکم

جو ابلنے والے چاولوں اور ابالنے والی عورت دونوں کا مالک تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا حکم بھی تھا جو خوشی سے سرشار ہونے کے باوجود اس موجودہ لمحے کی شدت کا اسیر ہو گیا تھا۔ وہ اس دیوار کو توڑنا چاہتا تھا تاکہ اس کی خوشی چاروں طرف پھیل سکے۔ وہ چاہتا تھا کہ کلثوم بھی اسے جان لے۔ سیاہ حاشیے کی ساڑھی میں ملبوس وہ عورت جوانے بھرپور جسم، ننگے بازوؤں اور ننگی پیٹھ کے ساتھ آگ کے گرد گھوم رہی تھی۔

رحیمہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ پھر اس کے پاس آنے کے بجائے وہ دروازے کی طرف بڑھی اور ایک ایسے عجیب لہجے میں بولنے لگی جو اس کی الجھن کی چغلی کھا رہا تھا۔ ''ان کی ٹانگیں دکھ رہی ہیں میں نے انہیں دبانا ہے۔ تم اپنا کام کیے جاؤ۔ میں بھی جلد ہی آ رہی ہوں۔'' اسے محسوس ہوا جیسے اس کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھا ہے۔

''دروازہ بند کر دو'' مجید نے سرگوشی کی۔

اتنی دیر آگ کے قریب رہنے کی وجہ سے رحیمہ کو حدت کا احساس ہو رہا تھا۔ دھان کی خوشبو اس کے جسم سے یوں آ رہی تھی جیسے وہ خود دھرتی ہو، جس نے یہ فصل پیدا کی ہے۔ جونہی وہ چارپائی کے کونے پر بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دبانے لگی تو مجید نے گہرا سانس لیا۔ اس کی کانچ کی چوڑیاں چھن چھن کر رہی تھیں اور جلد ہی اس محنت سے اس کا سانس پھولنے لگا۔ کمرے میں خاصا اندھیرا تھا پھر بھی مجید اس کی جنبش کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اس کی سمت میں دیکھتا رہا اور گرد و غبار کی طرح بوجھل دھان کی گہری خوشبو میں سانس لیتا رہا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے کو چیر رہی تھیں لیکن اس کے خیالات بار بار صحن کا رخ کر رہے تھے۔ کوئی بھید بھید ہی رہے تو وہ بھید نہیں ہوا کرتا۔ چاند کو گہن لگ سکتا ہے لیکن اس کا ہالا پھر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ باہر کھڑی عورت کو یہ سب کچھ جتلانے کے لیے اس کا من مچل رہا تھا۔ ننگے بازو اور ننگی پیٹھ والی عورت کو وہ اس ہالے کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

مجید کے لیے رحیمہ دریا کی مانند تھی۔ وسیع و عریض دریا جس کو پار کیا جا سکتا ہے لیکن اسے آغوش میں نہیں لیا جا سکتا۔ کتنی ہی دیر تک مجید باہر کی آواز پر کان لگائے رہا۔

جب رحیمہ صحن میں واپس آئی تو آسمان میں پچھّم کی طرف ایک تنہا ستارہ چمک رہا تھا۔ آگ تقریباً سرد ہو چکی تھی لیکن ساکن ہوا میں دھواں اب بھی اٹھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کلثوم چاول چکھ رہی تھی۔ اس نے رحیمہ کی طرف توجہ نہ کی۔ کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کسی سست رو خواب کی مانند مشرق سے روشنی کی ایک ہلکی سی لہر نمایاں ہونے لگی۔ لمبی

رات ختم ہونے کو تھی پھر بھی وہ خاموش ہی رہیں۔

صبح کی روشنی سے فضا منور ہوگی تو مجید باہر نکلا۔ گھر کے پچھواڑے تالاب میں نہانے کے بعد اس نے وضو کیا اور صبح کی نماز پڑھنے لگا۔ بادِ نسیم کے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ایک جھونکے نے اس کی میٹھی اور سریلی آواز کو دور تک پھیلا دیا۔

رحیمہ اور کلثوم نے آواز سنی تو یکدم انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں اداس دکھائی دے رہی تھیں۔

''نماز کا وقت ہوگیا ہے'' کلثوم کہنے لگی۔

رحیمہ ہولے سے کانپی اور چادر اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لی۔ اب انہیں کسی گھبراہٹ کا احساس نہ تھا۔ خدا کے نام کے ساتھ ایک نئے دن کا آغاز ہوگیا تھا۔

باب نمبر 9

اس صبح مجید نے زیادہ ہی خضوع وخشوع کے ساتھ عبادت کی۔ اس کی زمین، خدا کی دھرتی، دھان کی فصل کی باس اس کے نتھنوں میں سمائی ہوئی تھی اور وہ خدا کی عنایتوں کا تہ دل سے شکر ادا کر رہا تھا۔ لیکن جب بھی اس کے دل میں خدا کی شکر گزاری کی لہر اٹھتی ساتھ ہی یہ خوف بھی سر اٹھانے لگتا کہ یہ ساری خدائی نعمتیں یکدم ختم ہو سکتی ہیں۔ اب اس میں اپنی فریب کاری کا احساس تو زندہ نہ رہا تھا لیکن یہ خدشہ ضرور موجود تھا کہ کسی نہ کسی دن اسے گاؤں والوں کی طرف سے کسی ناپسندیدگی بلکہ مزاحمت کا سامنا ہو سکتا ہے یا شاید اسے اپنی حیثیت برقرار رکھنے کی خاطر جدوجہد ہی کرنی پڑے۔ اس کے ذہن میں یہ بات واضح نہ تھی کہ کس طرف سے اور کیا حملہ ہو سکتا ہے۔ خیر اس قسم کے خیالوں سے وہ زیادہ گھبرایا نہیں کرتا تھا کہ اس کے نزدیک زندگی عبارت ہی جدوجہد سے تھی۔ اس نے کبھی ظاہر تو نہ کیا تھا لیکن وہ ہر وقت کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

لیکن اس روز چھوٹی سی خبر نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ بس اس خیال سے اسے لحاتی تسکین ملی کہ صبح کو اس نے زیادہ دل لگا کر دعائیں مانگی تھیں۔

مسلم بنگال میں رواج یہ ہے کہ فصلوں کی کٹائی کے فوراً بعد ہر سال پیر اس وقت اپنے مریدوں کے گھر آتے ہیں جب ان کے گھر اناج سے بھرے ہوتے ہیں۔ کشتیوں سے، بیل گاڑیوں سے یا پھر سٹیمر اور ٹرین سے وہ اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں اور ان مقامات کا رخ کرتے ہیں جہاں ان کے امیر ترین مرید رہتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر وہ کئی کئی دن ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں۔ دعوتیں اڑاتے ہیں۔ دعاؤں کے اجتماع منعقد کرتے ہیں۔ بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کرتے ہیں۔ بیماروں اور صحت مندوں دونوں ہی

کے لیے یکساں طور پر دعائے خیر کرتے ہیں۔

محبت پور سے چار میل مشرق کی جانب نواب پور کا چھوٹا سا مگر گنجان گاؤں آباد ہے جس کی آبادی مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی گاؤں میں مقامی ضلعی حکومت کا سربراہ مطلوب خان رہتا تھا اور اب اس کا پیر اسے ملنے کے لیے آیا تھا۔

یہ پیر ایک سن رسیدہ آدمی تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں اس کی آنکھوں سے شعلے برستے تھے اور زبان میں گہرے بادلوں جیسی گرج تھی۔ کئی نسلیں پہلے اس کے بزرگ خدا کا دین پھیلانے کی خاطر راہ کی ہزاروں مصیبتیں اٹھاتے ہوئے ایران کے دور دراز ملک سے بنگال آئے تھے۔ پیر کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس بات کو کتنے زمانے بیت گئے ہیں۔ اپنی سہولت کے لیے اور خاص طور پر اپنے نامور بزرگوں کی آمد جیسے اہم واقعہ کے بارے میں لوگوں سے اپنی بے خبری کو چھپانے کے لیے اس لیے مشہور کر رکھا تھا کہ اس کے بزرگ اسی سال ہونے آئے تھے جس سال بنگال کے ایک پٹھان گورنر کا انتقال ہوا تھا۔ یہ گورنر رنڈی بازی اور افیون خوری کی وجہ سے تاریخ میں بڑا بدنام تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ ان کے جانثار مریدوں میں سے نہ تھے وہ اسی قسم کے الزام پیر پر بھی لگاتے تھے۔

شکل شباہت میں بھی پیر اب اپنے بزرگوں اور ان کے ہم وطنوں جیسا دکھائی نہ دیتا تھا۔ البتہ اس کی ناک اب بھی بہت نمایاں تھی اور رنگ خاصا صاف تھا۔ کئی نسلوں سے اس کا خاندان وسطی ضلعوں میں سے ایک میں آباد تھا۔ وہ ایک ایسی کھردری اور گنوار بولی بولتا تھا جو اس کے اعلیٰ رتبے سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ لیکن ایامِ شباب میں وہ دور شمال کے ایک مشہور دینی مدرسے میں پڑھتا رہا تھا۔ وہاں اس نے دین کے معاملات کا فہم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ شمال کی اس زبان میں بھی کام چلاؤ مہارت حاصل کی تھی جس کو مذہب کی روح کے اس کی اپنی بولی کے مقابلے میں زیادہ قریب سمجھا جاتا تھا۔ اس زبان میں دیا جانے والا خطبہ ہمیشہ اثر آفرین ہوتا تھا۔ چونکہ وہ خطبے بازی کے علاوہ اور کچھ کرتا ہی نہ تھا اس لیے اپنی بولی استعمال کرنے کی ضرورت شاذ و نادر ہی پڑتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس کا بہت احترام کیا جاتا۔ کم لوگ ہی اس کی باتیں سمجھتے تھے لیکن اس کا اثر و رسوخ پہلے سے بہت بڑھ گیا تھا۔

پیر کی شہرت کی اب کوئی حد نہ تھی۔ اس کی روحانی طاقتوں اور اس کے معجزوں

کے بارے میں لاتعداد کہانیاں مشہور ہو چکی تھی۔ مثال کے طور پر ایک کہانی یوں بیان کی جاتی تھی کہ اس گناہ بھری اور بدکار دنیا سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک بار اس نے فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ ایک بہت بڑے اجتماع کے سامنے تبلیغ کرتے ہوئے اچانک وہ جنت کی طرف اٹھنے لگا تھا لیکن اس کے مریدوں کے واویلا اور دردناک التجاؤں نے اس کا دل نرم کر دیا اور وہ پھر سے زمین کی طرف پلٹ آیا۔

یہ قصہ بھی مشہور تھا کہ ایک بار کوئی شخص کشتی میں پڑا سو رہا تھا لیکن کشتی لنگر سے ٹوٹ کر کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ ایسے میں پیر خوابیدہ شخص کو خواب میں دکھائی دیا اور اسے خطرے سے آگاہ کیا۔ اس طرح اس کی جان بچ گئی۔ ایسے ہی اپنے ایک عارضی قیام کے دوران پیر نے ایک مقامی زمیندار کے متعلق پیش گوئی کی تھی کہ اس پر مسلح ڈاکو حملہ کریں گے۔ غرض یہ کہ پیر کی عظیم الشان طاقتوں کے بارے میں ہزاروں قصے زبان در زبان منتقل ہوتے رہتے تھے۔ گاؤں گاؤں ان کا چرچا تھا۔ یہاں تک کہ اب ایک علاقے سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بھی اس کی شہرت پھیلنے لگی تھی۔

یہی عجیب و غریب شخص اب محبت پور سے صرف ایک گھنٹے کے پیدل سفر کے فاصلے پر ڈیرے ڈالے ہوا تھا۔ مجید کو اس بات سے پریشانی لاحق تھی اور یہ پریشانی اس کی دانست میں بلاوجہ نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ ایک درویش کی قبر کے محافظ کے طور پر اس کا احترام کیا جاتا تھا اور اس کا اثر و رسوخ بھی تھا۔ لیکن اس کی غیر معمولی روحانی قوتوں کے بارے میں کوئی معجزاتی داستان مشہور نہ تھی۔ اس نے لوگوں کے دلوں میں خدا کی دھاک ضرور بٹھا دی تھی۔ انتھک تبلیغ سے ان کی اخلاقی حالت سدھاری تھی اور ضرورت پڑنے پر نافرمانوں کے خلاف سخت قدم بھی اٹھانے تھے لیکن وہ خود ایک عام فانی انسان ہی رہا تھا۔ اس کی ساری قوت اور جلال مزار کے اسرار کا مرہون منت تھا۔

مزار پر حاضری کم ہونے لگی تو مجید بہت فکرمند ہو گیا۔ وہ پہلے ہی دیکھ رہا تھا کہ گاؤں کے لوگ جوق در جوق مشرق کا رخ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پیر کے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں پیر کو دیکھنے کا واقعی کسی قدر اشتیاق تھا۔ اگر اس کی قربت میسر آ جاتی تو وہ پیر کے پاؤں چوم لینے کی آرزو کرتے تھے۔ مجید مایوسی کے عالم میں بڑبڑانے لگا ہاں ہاں چوموا اس کے بھدے گھٹیا کے مارے پاؤں۔ اکثر لوگ تو بس اس کی ایک جھلک دیکھنے کو ہی مرے جا رہے تھے کہ جب بھی وہ باہر نکلتا۔ اس کے گرد فوراً ہی بڑا ہجوم

اکٹھا ہو جاتا۔ ہاں اس کی ایک جھلک ہی کافی تھی۔ بعض ایسے بھی تھے جو اسے نظر بھر کے دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ آنسو ان کی آنکھوں میں تیرنے لگتے اور انہیں کچھ دکھائی نہ دیتا۔ صرف چند خوش نصیب ہی اس کے ہاتھوں کو چھو سکتے تھے جن میں اب بڑھاپے کی وجہ سے ،رعشہ آ گیا تھا یا پھر اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں میں کانپنے والے چند الفاظ سن سکتے تھے۔

گزشتہ چند روز سے لوگوں کی زبانوں پر بس اسی کا نام تھا جنہوں نے اسے دیکھا بھی نہ تھا وہ بھی بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔ مجید توجہ سے سب کچھ سنتا رہا لیکن اپنی زبان اس نے بند رکھی۔

راتوں کی نیند پریشان خیالی نے اچک لی۔ رحیمہ اس کی ٹانگیں دباتی ،لیکن اسے کوئی احساس ہی نہ ہوتا۔ رحیمہ کو بھی احساس تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے مگر وہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکی۔ آخر کار اس نے ہمت کی اور بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

''میں نے سنا ہے کہ پیر ابھی تک یہیں ہے۔ لوگ اسے جانے ہی نہیں دیتے۔'' وہ کہنے لگی۔

جواب دیے بغیر مجید نے پہلو بدلا۔ اس نے ایک گھٹنا اٹھایا اور کسی خیالی مچھر کو مارنے کی خاطر دونوں ہاتھ بجائے۔ رحیمہ سوچنے لگی کہ واقعی مجید کے ساتھ کوئی بہت بڑی واردات ہوگئی ہے اسے خوف آنے لگا۔ خاموشی سے اٹھ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

مجید خیالوں میں کھویا رہا۔ پیر کے بجائے اسے اپنے لوگوں پر غصہ آ رہا تھا۔ انہیں اپنے گاؤں میں موجود برکتوں کے منبع کا خیال ہی نہیں اور وہ اس اجنبی سے برکات حاصل کرنے کے لیے بھاگ بھاگ کر جاتے ہیں اور اس کی عظمت کے گن گاتے واپس آتے ہیں۔ ''ناشکرے'' مجید اندھیرے میں لیٹا ہوا بڑبڑانے لگا ''حد ہے ناشکرے پن کی'' شدید غصہ کے عالم میں اس نے تلخی سے سوچا کہ یہ ناشکرے لوگ اسی نام نہاد مزار کسی نامعلوم کی قبر کے ہی لائق ہیں۔ اگر کبھی میں نے یہاں سے جانے کا ارادہ کیا تو انہیں سچی بات بھی بتا دوں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ کیسے میں نے سالہا سال تک انہیں بے وقوف بنائے رکھا۔ پھر مزار کی سرخ چادر پھاڑ کر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ دنیا بہت بڑی ہے اور ہزاروں ایسی جگہیں ہیں جہاں میں جا سکتا ہوں۔

مجید کو معلوم تھا کہ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ اسی نے مزار کو تخلیق کیا تھا اور وہ اسے برباد نہیں کر سکتا تھا کہ اب وہ اس کے چکر میں پھنس چکا تھا۔ اس کا غلام بن گیا تھا۔

ٹین کی چھت کے کناروں سے شبنم قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی۔ دیر تک مجید جاگتا رہا اس کا ذہن تشویش میں مبتلا تھا اور جسم اکڑا ہوا تھا۔

دوسری شام پہلے سے بھی کم لوگ روزمرہ کی عبادت کے لیے آئے۔ مغرب کی طرف شام کی روشنی آہستہ آہستہ مٹیالی دھند میں کھو گئی۔ جب ستارے طلوع ہوئے تو وہ معمول سے زیادہ روشن اور قریب تر محسوس ہو رہے تھے۔ لیکن مجید کا دل اب بھی اداس تھا جیسے اسے غم کے سیاہ بادلوں نے گھیر رکھا ہو۔

خلیق آنکھیں بند کر کے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے مجید کو بغور دیکھ رہا تھا۔ یونہی وجدانی طور پر اسے محسوس ہوا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔

دیر تک نماز پڑھنے کے بعد مجید قدرے نرم پڑا اور مسکرانے لگا درگزر کرنے والی شیریں مسکراہٹ۔

''میں اس بات پر غور کرتا رہا ہوں کہ'' اس نے کہنا شروع کیا ''جب جسم و جان کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے تو انسان یقیناً خدا کے قریب تر ہو جاتا ہے اس دنیا میں ترغیبات بہت ہیں۔ درویش بھی ان کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ مجید ایک پل کے لیے رکا۔ مزار کی طرف رخ کیا اور پھر مسکرانے لگا۔ پل بھر کو اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ نہ ہی اس کے سامعین نے کوئی سوال کیا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں عجب سی روشنی سے چمک رہی تھیں۔'' میں اس کا غلام ہوں جس کا خدا کے ساتھ پاک تعلق ہے کیونکہ وہ خون جسم و جان کے بندھن سے چھوٹ کر پاک ہو چکا ہے''۔

شاید خلیق اس کی باتوں کا مطلب سمجھ رہا تھا یا شاید اس کے پلے بھی کچھ نہیں پڑا تھا۔ مجید کو اس کی پرواہ نہ تھی کیونکہ اسے زمیندار کی وفاداری کی طرف سے کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ ابھی تک پیر کے دیدار کے لیے نہیں گیا تھا۔

مجید نے آنکھیں دوبارہ بند کر لیں مگر وہ شیریں مسکراہٹ وہ ناقابل بیان مسکراہٹ جو سچی مسکراہٹ نہیں تھی غائب ہو چکی تھی۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نگاہیں غضب ناک تھیں۔ خلیق کے سوا صرف دو اور افراد موجود تھے اور مجید نے ان پر نظریں گاڑیں ہوئی تھیں۔ پھر اس نے اپنی نگاہوں جیسی غضب ناک آواز میں کہا

''میرے بھائیو! ہمیں کسی انسان کی پوجا نہیں کرنی چاہیے کیا مجھے کچھ اور بھی کہنا چاہیے؟''

خلیق جس سے وہ مخاطب نہ تھا زور سے کہنے لگا ''نہیں''۔

نہ ہی تمہیں اس عظیم اور مقدس روح کی توہین کرنی چاہیے جو ہمیشہ ہمارے درمیان موجود رہتی ہے۔ وہ مہربان روح ہے لیکن وہ جلالی بھی ہے کیا مجھے مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟''

''نہیں'' اس بار دونوں دوسرے آدمیوں نے جواب دیا۔

مجید نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اب اس کی پلکوں پر ایک نرمی کی کیفیت نمایاں تھی۔

باب نمبر 10

مصیبت وہاں سے نازل ہوئی جہاں سے اسے بالکل امید نہ تھی۔

جب سے پیر گاؤں آیا، خلیق کی بیوی امینہ کے دل میں اندر ہی اندر ایک آرزو مچلنے لگی تھی۔ اس کی شادی کو تیرہ برس بیت چکے تھے۔ اب اس کی عمر تیس برس سے اوپر تھی۔ لیکن رحیمہ کی طرح وہ بھی بے اولاد تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عورت اتنے لمبے عرصے تک بے اولاد رہے تو پھر ضرور کوئی گھپلے کی بات ہوتی ہے۔ ماں بننے کی تمام امیدیں آہستہ آہستہ دم توڑ چکی تھیں۔ کیا وہ ہمیشہ یونہی بچوں سے محروم رہے گی؟ اس تصور نے اسے پریشان اور مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر اسے خلیق کی دوسری بیوی تانو کی حسد کی آگ میں جلنا بھی پڑتا تھا جو ہر سال نئے بچے کو جنم دیتی تھی۔ یہ آگ اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

پیر کی آمد نے امینہ میں ایک نئی امید پیدا کر دی تھی۔ شاید وہ مدد کر سکتا تھا۔ صرف شاید نہیں اسے معلوم تھا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ ہر زبان پر یہ قصہ تھا کہ وہ کئی بانجھ عورتوں کی گود ہری کر چکا تھا۔ بس مسئلہ اتنا تھا کہ پیر سے اپنا مسئلہ بیان کیا جائے اور مدد کی التجا کی جائے۔ باقی سب کچھ آسان تھا پیر اسے برکتوں والا دم دیا ہوا پانی دے گا اور وہ اسے پی جائے گی پھر جلد۔ بہت ہی جلد۔ وہ بھی اس درد کی شکایت کرنے لگے گی جس کی شکایت تانو ہر سال کرتی تھی۔ ''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے'' وہ شرمیلے انداز میں کہتی ''مجھے چکر آ رہے ہیں'' اس کے ساتھ ہی سب لوگوں کو خبر ہو جاتی۔ دایہ کا کام کرنے والی بوڑھی اماں کو طلب کیا جاتا اور وہ ہنسی مذاق میں اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہتی ''اچھا تو اب مجھے ایک اور دروازہ کھولنا پڑے گا''۔ وہ ایسے ہی مزاحیہ باتیں کیا کرتی تھی اور کبھی کبھی تو بے ہودہ باتوں پر بھی اتر آتی تھی۔ لیکن ہر کوئی ہنس دیا کرتا تھا۔ ان باتوں کا خیال آتے ہی امینہ کا منہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ جلدی سے خود کو پنکھا جھلنے لگی، حالانکہ یہ ایک

ٹھنڈے دن کا واقعہ ہے۔

لیکن جلد ہی وہ دوبارہ اپنے متعلق سوچنے لگی۔ اس نے زندگی کے تیس برس گزار لیے تھے۔ مگر وہ کسی لحاظ سے بھی بوڑھی نہ تھی۔ اس کا چہرہ دلکش اور سندر تھا رنگ صاف اور کولھے چوڑے تھے۔ وہ تانو کی طرح زیورات سے لدی پھندی نہیں رہتی تھی۔ پھر بھی اس میں ایک کشش تھی۔ اس کا بچہ بھی یقیناً پیاری سی موٹی سی چیز ہوگا اور وہ بھی اسے بدروحوں سے بچانے کے لیے اس کے ماتھے پر چراغ کی کالونس لگایا کرے گی۔

لیکن اس کے ذہن میں ایک مشکل سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سوال نے اس کے سپنوں کو تتر بتر کر دیا۔ پیر سے وہ دم کیا ہوا پانی کیسے حاصل کرے گی؟ شاید وہ اپنے شوہر سے اس کا ذکر کرے گی اور پانی لا کر دینے کو کہے گی۔ لیکن یہ بہت ہی مشکل بات تھی۔ شاید حاملہ ہونے سے بھی زیادہ مشکل۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ اکیلے میں خلیق سے میل گزشتہ کچھ عرصے سے تقریباً محال ہی ہو گیا تھا۔ بالفرض اگر وہ چند لمحوں کے لیے ہاتھ آ بھی جائے تو وہ اس قسم کے موضوع پر بات کیونکر شروع کرے گی؟ اس کی تو غالباً زبان ہی گنگ ہو جائے گی۔

یونہی ایک ہفتہ بیت گیا۔ اب پیر کی واپسی کے چرچے ہو رہے تھے۔ امینہ کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ اس کے لیے آخری موقع تھا اور وہ اسے کھونا نہ چاہتی تھی۔ کانپتی ہوئی ہلکی سی آواز میں اس نے کہا ''پیر سے مجھے دم کیا ہوا پانی تو لا دو'' خلیق نے یہ سنا تو دم بخود رہ گیا۔

''پیر سے دم کیا ہوا پانی..... مگر کس لیے''؟

امینہ نے ساڑھی کے پلو سے سر ڈھکا۔ اسے امید تھی اور وہ دعا بھی کر رہی تھی کہ اس کی طرف سے کچھ کہے بغیر ہی وہ سمجھ جائے گا۔

جواب نہ ملنے پر خلیق واقعی سمجھ گیا تھا۔ لیکن جب اس نے اس بارے میں سوچنا شروع کیا تو فوراً ہی مجید اس راہ میں پہلی بڑی رکاوٹ کے طور پر اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ پر وہ اپنی بیوی کی مدد کرنے سے انکار کیسے کر سکتا تھا جس کے خالی گود کے دکھ کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ بے توجہی سے اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ کہے بنا چلا گیا۔ وہ اب بھی سوچ رہا تھا کہ پیر سے پانی حاصل کرنے کا انتظام کیسے ہوگا۔ بظاہر نہ تو وہ خود پیر کے پاس جا سکتا تھا اور نہ ہی اپنے گھر سے کسی اور کو بھیج سکتا تھا کہ وہ بھی فوراً ہی پہچانا

جاتا۔ خیر اب اسے کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈنی ہی پڑے گی۔

ان دنوں دوسری بیوی کا بھائی دہلہ میاں، اس کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور ایک مہینے سے اس کی مہمان نوازی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ یہ نوجوان صبح کو دیر سے اٹھتا۔ بھرپور ناشتے پر ہاتھ صاف کرتا اور پھر سو جاتا۔ سہ پہر کو اٹھ کر مرغن کھانوں پر ٹوٹ پڑتا اور پھر سو جاتا۔ اصل میں وہ سارا دن سو کر کاٹ دیتا تھا۔

کبھی کبھی اس کے دل میں کچھ کرنے کا خیال آتا اور وہ مچھلی پکڑنے کا کانٹا لے کر گھر کے پیچھے جوہر کی طرف جا نکلتا۔ یہ جوہڑ مچھلیوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس کے ہاتھ کبھی ایک مچھلی بھی نہ لگی تھی۔ چند گھڑیوں کے انتظار کرنے کے بعد وہ اونگھنے لگتا۔ جاگنے پر اگر مچھلیاں چارہ بھی کھا گئی ہوتی تو وہ مایوسی سے ''اوہو'' کہتا اور پھر کوئی اور راہ سجھائی نہ دینے پر گھر کا رخ کرتا۔ واپس آتے ہی وہ موسم کے لذیذ پھل سیر ہو کر کھاتا، زور سے ڈکار لیتا اور پھر سو جاتا۔

اپنے مسئلے پر سوچ بچار کرتے کرتے خلیق دہلہ میاں کے پاس گیا اور کہنے لگا ''میں چاہتا ہوں کہ تم میری تھوڑی سی مدد کرو''۔

سوال پوچھنا تو بڑی کوفت کی بات تھی۔ اس لیے دہلہ میاں محض خلیق کی طرف دیکھ کر مزید سننے کا انتظار کرنے لگا۔

خلیق نے اسے بتایا کہ کیسے اس کی پہلی بیوی برس ہا برس سے بچے کی آرزو کر رہی ہے، خالی گود سے اس کو کس قدر رنج پہنچتا ہے اور یہ کہ اب وہ پیر سے دم کیا ہوا پانی حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔ پھر اس نے اپنا منصوبہ بیان کیا جو اس کے خیال میں بہت ہی دانش مندانہ تھا۔ دہلہ میاں صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے اس قدر چوری چھپے سفر پر روانہ ہوگا کہ مویشیوں تک کو اس کے جانے کی خبر نہ ہوگی۔ مطلوب خان کے گاؤں میں پہنچ کر اسے بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ کسی کو یہ پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ وہ محبت پور سے آیا ہے، خلیق سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر کوئی پوچھے کہ وہ کہاں سے آیا ہے تو اسے بتانا چاہیے کہ وہ دریا کے اس پار رہتا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیر کو جو وہ قصہ بتائے گا وہ اس قدر ٹھیک ٹھاک اور دردناک ہونا چاہیے کہ پیر انکار کرنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکے۔ اسے اس بات پر زور دینا چاہیے کہ سوال محض کسی بے اولاد عورت کو خوش کرنے کا نہیں بلکہ بچہ حاصل کرنے کے خدائی حکم کی تعمیل کا مسئلہ بھی ہے

تا کہ زندگی کا شعلہ اور خاندان کی شمع روشن رہے۔

''کہنا کہ'' خلیق نے وضاحت کی ''دونوں ہی مصیبت میں ہیں۔ مرد بھی اور عورت بھی، سمجھ گئے ہو ناں؟

خلیق نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا انتخاب بالکل درست ہے کیونکہ دہلہ میاں کے چہرے پر ہمیشہ ہوائیاں اڑتی رہتی تھیں۔

دہلہ میاں نے اثبات میں سر ہلایا۔

جب دوبارہ اسے خلوت میسر آئی تو اس نے بیڑی سلگائی اور ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی اور وہ پریشان سا تھا جو کام اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ اسے پسند نہ تھا۔ صبح سویرے باہر نکلنا ہی اس کے لیے اذیت ناک تھا اور پھر گاؤں سے باہر کچھ فاصلے پر جو آسیب زدہ درخت تھا، اس سے اسے خوف بھی آتا تھا نواب پور جاتے ہوئے اس کے پاس سے گزرنا ہی پڑتا تھا۔

جوں جوں اس نے سوچا۔ یہ کام اسے زیادہ ناخوشگوار لگنے لگا۔

''کیوں بھئی تم سو رہے ہو؟''

خلیق دوبارہ اس سے مخاطب تھا۔ دہلہ میاں نے اٹھنے کا اشارہ تو دیا لیکن یونہی لیٹا رہا۔

''ہاں یہ بات پلے باندھ لو۔ تمہاری بہن کو بھی اس معاملے کی بالکل خبر نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں پتہ ہے اس کی زبان کس قدر دراز ہے۔ بس کسی کو بھی نہیں پتہ چلنا چاہیے سمجھ گئے ہو نا؟

دہلہ نے بے دلی سے سر ہلایا۔ لیکن وہ املی کے درخت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ املی کا وہ بڑا درخت جو رات کے اندھیرے میں جنوں بھوتوں اور بدروحوں کا مسکن بن جاتا تھا۔ آدھی رات سے لے کر نور کے تڑکے تک تو وہ خاص طور پر خطرناک ہوتا تھا اور پھر اس سے بچنے کی کوئی راہ بھی نہ تھی۔

سہ پہر کو دہلہ میاں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بالآخر ایک ترکیب سوچ لی تھی۔ اس نے کُرتا پہنا اور خلیق کو حقہ پیتے اور آرام کرتے چھوڑ کر چپکے سے گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ تیز تیز مگر بے ہنگم قدم اٹھا رہا تھا کیونکہ اسے آہستہ آہستہ چلنے کی عادت تھی۔ جب وہ مزار تک پہنچا تو اس نے نیم کے درخت کے سائے میں مجید کو کسی سے باتیں کرتے دیکھا۔ اس

کے قریب جا کر دہلہ میاں نے اس کے کان میں سرگوشی کی ''میں نے تم سے ایک بات کہنی ہے۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگا ''علیحدگی میں''۔

دونوں ڈیرے کے اندر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ اس نے مجید کو پیر سے دم کیا ہوا پانی حاصل کرنے کی امینہ کی خواہش کا سارا قصہ سنا دیا مجید کے تیور بدلنے لگے لیکن وہ پرسکون رہا۔ اس نے دہلہ میاں کو بات ختم کرنے دی اور پھر پوچھنے لگا اچھا تو تم کب جا رہے ہو؟'' دہلہ میاں دانت نکالنے لگا۔

''یہی تو بات ہے۔ میں نہیں جا رہا ہوں۔ اسی لیے تو تمہیں بتانے آیا ہوں سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی اس پیر میں کوئی یقین نہیں۔'' اس کا چہرہ چمکنے لگا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس نے کمال کر دیا ہے۔ ''میں سمجھتا ہوں'' وہ پھر سے کہنے لگا اس سادہ لوح عورت کو فریب نہیں دینا چاہیے جو بچوں کی خواہش میں مری جا رہی ہو۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ میری تجویز تو یہ ہے کہ تم خود ہی اسے تھوڑا سا پانی دم کر کے دے دو''۔

مجید خاموش رہا۔ وہ الجھن کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ کنکھیوں سے اس نے آنے والے کا جائزہ لیا جیسے اس کے آنے کے مقصد کا پتہ نہ چل رہا ہو۔ دہلہ میاں بے چین ہونے لگا۔ گھبراہٹ میں اس نے یکدم پوچھ لیا ''اچھا تو تمہاری رائے کیا ہے؟''

مجید نے چند لمحے توقف کیا اور پھر پرسکون لہجے میں کہنے لگا ''تم جاؤ پیر کے پاس''

دہلہ میاں کا رنگ فق ہو گیا۔

''لیکن کیوں''

''بس بس! جاؤ''

واپسی پر دہلہ میاں کا جسم جھکا ہوا تھا اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ دن کی روشنی ابھی باقی تھی مگر اسے ہر جھاڑی میں بھوت رقص کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے عجیب وغریب چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ تو گویا پہلے ہی املی کے درخت کی چنگل میں پھنس گیا تھا۔

شام کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مجید اور خلیق حقہ پینے لگے۔ ڈھور ڈنگروں کی باتیں شروع ہو گئیں ساتھ والے گاؤں میں مویشیوں کی بیماری پھوٹ پڑی تھی وہ ان دنوں کا قصہ لے بیٹھے جب بہت سے مویشی بیماری کے ہاتھوں ختم ہو گئے تھے۔

تب اچانک مجید نے پینترا بدلا اور تھوڑا سا مسکراتے ہوئے کہنے لگا ''لگتا ہے تمہیں مجھ میں اور مزار میں زیادہ یقین نہیں ہے''۔

''کیا؟''

مجید نے اپنی شکایت دہرائی۔ خلیق خاصا بدحواس دکھائی دے رہا تھا۔

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو''۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مرے ہوئے درویش کی قوت زندہ پیر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔''

''تم یہ کیوں کہہ رہے ہو''؟ خلیق نے بے قراری سے پوچھا۔

مجید نے منہ کا رخ مزار کی طرف کرلیا۔

اگر وہ چاہے تو کوئی چیز ایسی نہیں جو ہمیں نہ دے سکے۔ اگر ہم اس سے التجا کریں، گناہوں سے بچیں تو وہ ہمیں سب کچھ یہاں تک کہ بچے بھی عنایت کر سکتا ہے۔ جنت میں رہنے والا درویش زمین پر موجود پیر سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔

خلیق ندامت میں ڈوب گیا اور اضطراب سے ہاتھ مروڑنے لگا۔ پھر اس نے کھانس کر گلا صاف کیا۔

اسے سنبھلنے کا موقع دینے کی خاطر مجید نے آنکھیں بند کیں اور متانت سے دعا مانگنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد خلیق نے کہا ''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ لیکن تمہیں پتہ ہی ہے کہ عورتیں عجیب وغریب ہوتی ہیں اور ان کی عقل بھی موٹی ہوتی ہے۔ خاص طور پر میری پہلی بیوی تو خیر ہے ہی ایسی۔ وہ ایک سادہ لوح عورت ہے۔ لیکن غمگین بہت ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ وہ چاہتی ہے.....''

''بس بس۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ یقین کرو یہ سب ٹھیک ہے اصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید اب تمہیں مزار میں یقین نہیں رہا''۔

خلیق نے دوبارہ ہاتھ مروڑے۔ اس کی آواز اندر کی بے چینی کو دھوکا دے رہی تھی۔

''نہیں۔ نہیں؟'' تمہیں پتہ ہی ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں''۔

''خیر، پھر سب کچھ ٹھیک ہے۔'' مجید نے اطمینان بخش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ بے اولاد عورت کے احساسات کیا ہوتے ہیں لیکن شاید اپنی بیوی

کے معاملے میں مجھ سے مدد لے سکتے تھے۔ شاید اس کے پیٹ میں کنڈل ہیں''۔

''کنڈل، کیسے کنڈل، خلیق کے لیے یہ بات بظاہر بالکل نئی تھی۔

''کنڈل بھئی'' مجید نے دہرایا ''جب کسی عورت کے پیٹ میں کنڈل ہوں تو پھر وہ حاملہ نہیں ہوسکتی۔

خلیق کو کرید ہوئی کہ یہ کنڈل کیا شے ہے؟

''میری بے خبری کو معاف کرو لیکن یہ کنڈل ہوتے کیا ہیں''؟

مجید مشفقانہ انداز میں مسکرا دیا۔ زمیندار کی بے خبری مضحکہ خیز تھی۔ لیکن اس کے لیے اسے ذمہ دار بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔

''خیر انہیں یوں آنکھوں سے تو نہیں دیکھا جاسکتا۔ ویسے یہ جانی بوجھی بات ہے کہ وہ بن جاتے ہیں اور عورت کو حاملہ ہونے سے روکتے ہیں''۔

''ان سے نجات کی کوئی راہ ہے؟''

ہاں مگر پہلے یہ جاننا ہوگا کہ اس کے پیٹ میں ہیں کتنے۔ مجید ایک پل کو رکا اور اپنے دوست کو تکنے لگا۔ خلیق کے ذہن میں کیا تھا؟ یہ کہ اگر اس نے آمینہ کا معائنہ کرنا ہے تو پھر اس کو ننگا کر کے دیکھے گا یا اپنے ہاتھ اس کے پیٹ پر پھیرے گا؟ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

''بھئی اس کا طریقہ تو بہت سادہ ہے'' وہ کہنے لگا ''جس عورت کے بارے میں شبہ ہو کہ اس کے پیٹ میں کنڈل ہیں۔ اسے ایک دن کے لیے فاقہ کرنا چاہیے اسے کسی سے بات بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے بجائے جسم میں اور روح کو پاک کر کے سارا دن قرآن کی تلاوت کرنی چاہیے۔ تب میں خصوصی دعا مانگوں گا اور اسے اپنا دم کیا ہوا پانی دوں گا۔ دم کیا ہوا پانی پینے کے بعد اسے مزار کے گرد چکر لگانا پڑے گا۔ اگر پانچوں پھیرے پر اسے ویسی درد ہو جیسی بچے کی پیدائش کے وقت ہوتی ہے تو پھر اس کے پیٹ میں پانچ کنڈل ہوں گے۔ اگر ساتویں پھیرے پر درد ہو تو پھر سات ہوں گے جتنی ان کے تعداد ہو اتنا ہی انہیں ختم کرنا دشوار ہوتا ہے۔

یکدم مجید نے دوبارہ مویشیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ خلیق بھی اس میں شامل ہوگیا لیکن مجید کو پورا احساس تھا کہ اس کا ذہن کسی اور جگہ گھوم رہا ہے۔

وہ خاموش ہوگئے۔ مجید نے حقے کا کش لیا۔ پھر خلیق کسی قدر گھبراہٹ کے ساتھ

کہنے لگا۔ یہ میری پہلی بیوی کا معاملہ ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آیا تم کچھ کرسکو گے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے کنڈلوں کے بارے میں''۔

مجید نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر سکون سے کہنے لگا ''تم جانتے ہی ہو کہ میں تمہاری مدد کرنے سے انکار نہیں کرسکتا''۔ ''تو کیا ہم آئندہ جمعے سے شروع کردیں؟

اس رات مجید مطمئن تھا۔ اس کی تشویش ختم ہوچکی تھی۔ پیر کا دھڑکا اب ختم ہوگیا تھا۔

پر وہ سوچنے لگا کہ انسان کس قدر جلد ڈرنے اور کانپنے لگتا ہے اور اس کا دل خدشوں سے دھڑکنے لگتا ہے۔ لیکن اچانک ایک پل میں یہ سب کچھ ختم بھی ہوجاتا ہے وہ ہمیشہ لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ انسان خدا کے بھیدوں کو نہیں جان سکتا۔ ہر بات کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ ان کا بھی جو بظاہر بے مقصد محسوس ہوتی ہیں۔ ہاں انسان کو سمجھنے میں خطا ہوسکتی ہے۔

اندھیرے میں دھیرے سے وہ کہہ اٹھا، خدا سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ نہیں جانتے۔

البتہ یہ بات یقینی ہے کہ خدا جو کچھ بھی کرتا ہے انسان کی بھلائی کی خاطر کرتا ہے انسان مصائب کا شکار ہوسکتا ہے۔ اس کی محنتیں رائیگاں جاسکتی ہیں۔ اسے ہر شے لاحاصل محسوس ہوسکتی ہے۔ لیکن پھر بھی مقصد ضرور کوئی نہ کوئی ہوتا ہے۔ مجید نے بے انتہا اطمینان اور خود اعتمادی کے ساتھ خود کو بتایا کہ انسان کی طرف سے سوال کرنا یا تجسس ظاہر کرنا قطعی بے فائدہ ہے۔ اندھیرے میں دانتوں کو خلال کرتے ہوئے اس نے سوچا ہاں جس بات کی میں تبلیغ کرتا ہوں اس میں ایمان بھی رکھتا ہوں۔ جہاں تک گاؤں والوں کا تعلق ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ خدا کی مرضی سے متعلق سوال اٹھانا لاحاصل ہے۔ اگر کبھی ان کے دل میں کوئی شبہ سر اٹھائے بھی تو وہ پہلی رات کے چاند کی طرح فوراً ہی افق میں غائب ہوجاتا ہے۔ ان کی پوری دنیا سے گرد لپٹے ہوئے اندھیرے میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ انسان کیوں صرف مرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ کیوں ایک سال تو بہترین فصل ہوتی ہے اور دوسرے سال سیلاب سب کچھ بہالے جاتا ہے، کیوں ایک شخص پیٹ بھر کر کھاتا ہے اور دوسرا فاقوں مرتا ہے انہیں اس قسم کے سوال اٹھانے میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟''

لیکن کیا وہ خود۔ مجید دوسروں سے زیادہ جانتا ہے؟ اس کا دعوی تو یہی ہے اور لوگ علم کے سبب اس کی عزت کرتے ہیں۔ سرخ کپڑے میں چھپی ہوئی قبر تو ازلی چپ سادھے ہوئے ہے۔ موت کے اس پار، اچھی اور بری فصل سے بے نیاز اور سکھ دکھ سے

ماورا ازلی اور نا قابل تسخیر چپ۔ کیا وہ واقعی یہ کہ سکتا ہے کہ وہ اس لیے ان سے زیادہ جانتا ہے کہ اسے پتہ ہے کہ قبر کی طاقت محض ایک ڈھونک ہے؟ اس کے باوجود وہ ایک عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

اب زندگی کے بھیدوں پر غور کرتے ہوئے اسے لگا کہ سارا خوف اور تشویش ختم ہوگئی ہے۔ بے تعلقی سے وہ انسانی مصائب و آلام کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ ان سوالوں کے جواب کی تلاش کی اب اسے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی شاید یہی وجہ تھی کہ اب وہ خوشی محسوس کر سکتا تھا۔

باب نمبر 11

آئندہ جمعے کو امینہ نے روزہ رکھا۔ پہلے تو اسے یہ جان کر شدید مایوسی ہوئی کہ اس کا شوہر پیر کا دم کیا ہوا پانی لا کر اسے نہیں دے گا لیکن کنڈیوں کا سن کر اسے قدرے اطمینان ہوا اور اس بات سے بھی تسلی ہوئی کہ مجید نے انہیں ختم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ خاموش رہ کر دکھ سہنے، خواہش کی آگ میں جلنے اور مایوس رہنے کی طویل مدت اب ختم ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ آخر کار کچھ نہ کچھ ہونے والا تھا۔

جلد ہی ایک اور پریشانی نے اسے گھیر لیا۔ فرض کرو کہ اگر اس کے پیٹ میں سات سے زیادہ کنڈل ہوئے تو؟ اگر چودہ ہوئے تو؟ پھر کیا ہوگا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اس قدر زیادہ ہوں کہ مجید کچھ نہ کر سکے۔

امینہ اس سارے معاملے کو راز میں رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، ہوائیں بھی سنتی ہیں ان سے کون کسی بات کو چھپا سکتا ہے؟ خلیق کی دوسری بیوی تانو نے عورتوں سے اس بارے میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمعے کے روز صبح سویرے سے وہ ایک ایک کر کے اسے دیکھنے کے لئے آنے لگیں۔ آمینہ کو کسی سے بات کرنے کی ممانعت تھی۔ وہ شمال کی طرف والے کمرے میں بیٹھی قرآن کی تلاوت کرتی رہی۔ کمرے کے جس کونے میں وہ بیٹھی قرآن پڑھ رہی وہاں سے اس اندھیرے کونے سے اس کی دبی دبی آواز آئے چلی جا رہی تھی۔ ساڑھی کے پلو نے اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا جو پہلے ہی آنے والے امتحان کے خوف اور تشویش سے وحشت زدہ ہو رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر عورتیں بیٹھی دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھیں تانو اس ڈرامائی صورت حال سے لطف اٹھا رہی تھی۔ مہمان عورتوں کو پان لگا لگا کے دے رہی تھی۔ پان چباتے ہوئے عورتیں کبھی کبھی گہری آہ بھرتیں اور پھر امینہ کی کامیابی اور خوشی کے لئے دعا کرتیں۔

دوپہر کے بعد مجید نے امینہ کے لئے تانبے کے صاف ستھرے پیالے میں جالی سے ڈھکا ہوا دم کیا ہوا پانی بھیج دیا۔ نہانے سے پہلے امینہ نے اس پانی کو اپنے پیٹ پر ملنا تھا چونکہ وہ پانی پاک تھا اس لئے اسے گندی زمین پر نہیں گرنا چاہیے تھا بس جوہڑ کے اتھلے پانی میں کھڑے ہو کر اسے یہ پانی چلو میں لے کر اپنے جسم پہ ملنا تھا۔

افق پر سورج ابھی بڑا سا سرخ گولہ بنا ہوا تھا دو کہار جنہیں امینہ کو پالکی میں بٹھا کر مزار تک لے جانا تھا وہ آخر خلیق زمیندار کی بیوی تھی۔ وہ کبھی پیدل چل کر گھر سے باہر نہیں گئی تھی۔

گھر میں اک سنجیدگی کا ماحول تھا اس کے اثر میں خلیق بھی سارا دن چپ چپ رہا۔ اب اس نے شمال والے کمرے میں جھانکا اور پوچھا کہ آیا وہ جانے کے لیے تیار ہے۔

امینہ ابھی تک تلاوت میں مصروف تھی۔ مگر اب بس نحیف سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مکڑی کے جالے کے تار کی طرح نحیف اور باریک۔ سہ پہر تک بھی اس کے چہرے پہ کچھ نہ کچھ رونق تھی مگر اس وقت تو چہرے کا رنگ بالکل اڑ چکا تھا۔ شام کے پھیلتے اندھیرے میں اس کا چہرہ کتنا پھیکا پھیکا نظر آ رہا تھا۔ الفاظ اس کی آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے۔ کبھی وہ بڑے بہت ہی بڑے ہو جاتے اور پھر اچانک سکڑنے لگتے یہاں تک کہ انہیں پڑھنا محال ہو جاتا۔

تانو اندر آئی اور کہنے لگی ''اٹھو بہن تمہارے جانے کا وقت ہو گیا ہے''۔

امینہ نے تانو کی بات سن لی تھی لیکن نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا کہ اس پر تو اچانک بلا کا خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس کی رقت بھری دھیمی آواز تھم گئی۔ پل بھر کے لئے وہ ساکن بیٹھی رہی۔ پھر اس نے کلام پاک بند کیا اور اسے ریشمی جزدان میں باندھ کر عقیدت سے بوسہ دیا۔ کلام پاک اور اس چھوٹی سی لکڑی کی رحل کو لے کر جب وہ اٹھی تو اچانک اسے لگا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑے گی۔ بس اپنی قوت ارادی سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

تھوڑی سی سونٹھ اور نمک اندر لایا گیا اور وہ اس نے کھا لیا۔ پھر وہ باہر نکلی۔ منہ دھویا اور مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اندر آ گئی۔

جب وہ دوبارہ باہر نکلی اور چھوٹے سے بے گھاس صحن کو عبور کر کے پالکی کی طرف بڑھنے لگی تو وہ بہت تھکی تھکی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا سر اور کندھے بسنتی بوندیوں والی سفید شال سے ڈھکے ہوئے تھے۔ شال اس نے کس کر لپیٹی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ

صحن سے گزر رہی تھی۔ آخر ایسا کون سا خوف تھا کہ بھاری پتھر کی طرح اس پر بوجھ بنا ہوا تھا اور جس کے بوجھ سے اس پر اتنی نقاہت طاری تھی۔ آخر اسے اتنا خوف کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ بانجھ پن کی اذیت تو وہ پہلے ہی سے کتنے برسوں سے سہتی چلی آ رہی تھی؟

ہاں اگرچہ اس نے برسوں تک دکھ اٹھایا تھا لیکن کسی نے کبھی اس سے صاف صاف یہ نہیں کہا تھا کہ اس کی گود ہمیشہ خالی رہے گی۔ کتنے سال آئے اور گزر گئے اور وہ حاملہ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ آنے والا سال بھی ایسا ہی ہوگا۔ دکھ کے ساتھ ساتھ ایک مدہوم سی امید بھی چلی آ رہی تھی لیکن آج مجید ایسی کوئی بات کہہ سکتا ہے کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے۔ ہمیشہ کے لئے بستر لپٹ جانے کی ماہر تو وہ ہوگی اور بانجھ پن کا وسیع و عریض صحرا ہوگا پھر وہ کس کے سہارے جئے گی۔

پالکی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اندھیرے سے جھینگروں کی آواز سنائی دی۔ تو کیا ''واپس ہو جانے اور جانے سے انکار کر دے؟ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی اس وقت ارادہ کیسے بدل سکتا ہے جب دوسرے اس کے فیصلے سے آگاہ ہو چکے ہوں جب اس کے ہر قدم کو دوسرے دیکھ رہے ہوں؟ اب واقعی ارادہ بدلنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

مجید اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے لمبا کُرتا اور چھوٹی سی پگڑی باندھ رکھی تھی یہ پگڑی اس نے خاص اس موقع کی خاطر پہنی تھی۔ وہ معمول سے بھی زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

بے ہنگم انداز میں امینہ پالکی سے اتری۔ مجید ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اب اس نے اپنی میٹھی اور سریلی آواز میں قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ یہ آواز شام کے اندھیرے پر چھاتی چلی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ وہ امینہ کو بھی غور سے دیکھتا رہا۔ امینہ نے پالکی سے اتر کر اپنا دایاں قدم آگے بڑھایا کہ لالٹین کی روشنی میں کچھ مدہم دکھائی دے رہا تھا۔ کتنا نرم اور خوبصورت پیر تھا۔ راستوں کی گرد اور سورج کی تمازت سے محفوظ پیر اور مجید کی خوش الحانی سے جو اک نقش جمیل فضا میں ابھرا تھا اس میں کچھ اور جمال پیدا ہو گیا۔ پھر وہ یکدم چپ ہو گیا۔ ایک پل کے بعد اس نے کہا وہ ان سے کہیں کہ مزار والی کوٹھری میں چلی جائیں''۔ پھر قدرے توقف کے بعد پوچھا، وضو تو کر لیا ہے ناں؟

قرآن پڑھنے، عبادت کرنے اور عبادت گاہ میں داخل ہونے سے پہلے

خود کو پاک صاف کرنا ضروری ہے۔لیکن وضو ٹوٹ بھی تو سکتا ہے ٹوٹنے کی کتنی ہی صورتیں ہیں کسی بھی صورت ٹوٹ سکتا ہے۔

امینہ نے ہولے سے سر ہلا کر بتا دیا کہ وہ وضو سے ہے۔

''اچھا تو پھر مزار کی طرف چلو''۔

امینہ کے سر پر پڑی ہوئی بسنتی بوندیوں والی شال نے لگ بھگ اس کا سارا چہرہ چھپا رکھا تھا۔راہ دیکھنے کے لئے اس نے شال ذرا سی سرکائی اور مجید نے اس کی نازک سی، چھوٹی سی ٹھوڑی کی ایک جھلک دیکھ لی۔

مزار والی کوٹھڑی میں دھیرے دھیرے چلنے والی دو موم بتیوں کی مدہم روشنی میں قبر، وہ خاموش قبر، بے پایاں سکوت میں ڈوبی قبر کتنی سرد اور ابدیت کی کیفیت میں ڈوبی نظر آ رہی تھی۔امینہ بت بنی کھڑی تھی اور مزار کو تکے جا رہی تھی اور لمحات گزرتے چلے جا رہے تھے۔مگر اس سے اس کے اندر جذبات کا کیا ہیجان برپا ہوا تھا۔اس کے چہرے سے کیا پتہ چلتا کہ وہ آدھا کھلا تھا اور آدھا ڈھکا تھا۔

مجید اسے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔کہ اس عورت کو یہاں کیا دکھائی دے رہا ہے۔کسی نے اس مزار کو کبھی اس طرح نہیں دیکھا تھا۔اس نے تلاوت شروع کر دی تھی۔ اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے اور لہجہ بلند ہوتا چلا جا رہا تھا۔اچانک وہ رک گیا ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوڑا سا کھانسا۔

''ان سے کہو کہ بیٹھ جائیں''۔

بیوی سے مخاطب ہو کر خلیق نے کہا''بیٹھ جاؤ''

وہ آہستہ سے بیٹھ گئی۔نظریں اب بھی مزار پر مرکوز تھیں اور مزار کی خاموشی اس کے جسم میں اترتی چلی جا رہی تھی۔اس کے پورے وجود میں پھیل رہی تھی، پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس قدر سنجیدہ دکھائی دینے لگی کہ مجید سوچنے لگا کہ کیا واقعی اسے سکون میسر آ گیا ہے۔کیا اب اسے اس دنیا کی کسی شے کی خواہش نہیں رہی۔وہ پھر تلاوت کرنے لگا، اس کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں بیچ میں چمک اٹھتیں۔

پانی سے بھرا ہوا پیتل کا پیالہ اس نے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا۔دعا مانگ کر اس نے پھونک ماری اور اس کے ہونٹ پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔اس کی مہین سریلی آواز کسی بے چین سانپ کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ہر شے سے

بے نیاز ہو کر یوں بیٹھ جانے کا امینہ کا انداز اسے بھایا نہیں۔ ایک بار پھر سانپ نے اپنا پھن پھیلایا اور پھنکارنے لگا اور ایک بار پھر پالکی سے اترتی ہوئی امینہ کا پاؤں اس کے تصور میں ابھر آیا۔ سانپ پھنکارا اور اس تصور میں زہر گھل گیا۔ کیوں وہ اس سے محبت کرے، کیوں اس پر عنایت کرے اگر ایسا ہوا ہوتا تو مجید گوٹا ٹنکے سرخ غلاف کو لیر لیر کر کے اس گھر کو جو اس نے اتنی محنت سے تعمیر کیا تھا ڈھا دیتا اور وہاں سے جان بچا کر اسے بھاگنا پڑتا۔ زہر اگلنا زیادہ آسان نہیں پر۔

مجید بار بار پانی میں پھونکیں مار رہا تھا۔ مدہم روشنی میں اس کی نگاہیں دھیرے سے بعینہ سے ہٹ کر مزار کی طرف اٹھ گئیں اور پھر وہ خلیق کو دیکھنے لگا جو بے خیالی اور بے بسی کے عالم میں یوں بیٹھا تھا جیسے شکر کا تھیلا ڈھیر پر پڑا ہو۔ اس میں کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی دولت اور نہ ہی اس کی زمین اس لمحے اس کے کام آ سکتی تھی۔ مجید مسلسل ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ سفید شال سے ڈھکا ہوا امینہ کا چہرہ ساکت تھا، پر تاثر سے خالی۔

مجید کھڑا ہو گیا۔

''انہیں پانی دو'' اس کی آواز سنائی دی۔

خلیق نے پیالہ لیا اور امینہ کے منہ کے پاس لے گیا۔ اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں۔ جیسے کسی کلی کی پنکھڑیاں کھل رہی ہوں۔ شال کے اندر سے ایک ہاتھ ہولے سے ابھرا اور سونے کی چوڑیوں کی ہلکی سی کھٹک سنائی دی۔

امینہ نے فوراً ہی پانی نہ پیا۔ پیالے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے ہونٹوں کے قریب کیا اور پانی کو دیکھنے لگی۔ یہ جوہڑ کا پانی تھا اور کچھ گدلا گدلا تھا۔ کسی عجلت کے بغیر نہایت خاموشی کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ پانی پینے لگی۔ یہاں عجلت کی کیا ضرورت تھی۔ یہ پاک پانی تھا جس پر خدا کا نام پڑھا گیا تھا۔ یہ کوئی عام پانی تھوڑا تھا جسے پیاس بجھانے کی خاطر پیا جاتا ہے۔ آہستگی اور خاموشی سے وہ اس کا آخری قطرہ تک پی گئی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ جو اس کے پاؤں جتنا نرم و نازک اور خوبصورت تھا پھیلا دیا۔ موم بتی کی ہلکی سی روشنی میں یہ ہاتھ خوابوں کی اس شے کی مانند دکھائی دے رہا تھا جو کبھی گرفت میں نہیں آتیں۔

جب اس کا ہاتھ ایک بار پھر شال میں چھپ گیا تو مجید کہنے لگا ''ذرا ان سے اٹھنے کو کہو۔ اب مزار کے چکر لگانے ہیں''۔

ایک لمحے کے لئے امینہ کی آنکھیں دہشت سے پوری طرح کھل گئیں۔ لیکن اس

نے جلد ہی خوف پر قابو پالیا اور پھر سے اس کا چہرہ بے تاثر ہوگیا۔''اب میں خاص دعائیں پڑھوں گا'' مجید نے اعلان کے انداز میں کہا ''انہیں کہو کہ مزار کے گرد چکر لگائیں۔آغاز بائیں طرف سے کرنا چاہیے اور پہلے دایاں قدم اٹھانا ہوگا۔تاہم قدم اٹھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیں''۔

مجید تاریک کونے میں بیٹھ گیا۔جب امینہ اس کے سامنے سے گزری تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ساڑھی کے نیلے حاشیے کے نیچے سے برہنہ پاؤں ایک کے بعد آہستہ آہستہ اور خاموشی سے اس کی نظروں کے سامنے آیا۔پہلے دایاں اور بعد میں بایاں۔ہوا کے جھکڑ کی طرح مجید کی آواز ایک دم سے بلند ہوگئی اور اس کی تلاوت جو ایک نقش جمیل ابھرا تھا وہ غائب ہوگیا۔ایک چکر۔دوسرا چکر۔کونوں کے پاس تو یہ جگہ زیادہ ہی دھندلی ہے۔امینہ نے سوچا۔شاید میں کوئی سپنا دیکھ رہی ہوں؟ اب وہ یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ ہے یا نہیں ہے۔اسے تھکاوٹ کا شدید تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا جیسے وہ کسی بے انتہا داستانی سفر پر چلی جارہی ہو۔اس کے پیلے چہرے پر کسی جذبے کا اب بھی کوئی نشان نہ تھا جیسے کبھی اس نے بات کی ہو، نہ ہنسی ہو، اور نہ ہی روئی ہو۔لیکن اندر ہی اندر اسے اپنی توہین کا احساس ہورہا تھا۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر ایک دراڑ پڑ گئی ہو۔کھوکھلے پن کی دراڑ جو پھیلتی۔اس طرح پھیلتی جارہی ہے کہ اس کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے۔کچھ باقی نہیں تھا۔کبھی ایک زمانہ پہلے ایک خواب دیکھا تھا اور ایک خواہش نے جنم لیا تھا۔سادا سا خواب اور سادی سی خواہش۔کبھی اسے یوں لگا تھا کہ کسی شے کی کمی ہے، اس کے اندر ایسی کوئی چیز ہے جو بھرنے کے لیے تڑپتی ہے۔اب کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔یہاں تک کہ خوف بھی نہیں۔

تین چکر پورے ہوگئے۔

دھندلکے میں اسے یہ خیال آیا۔لیکن کوئی بھی یونہی ہمیشہ کے لئے تو نہیں چل سکتا۔کوئی ایسا مقام تو آنا چاہیے جہاں کوئی رک جائے۔اب؟ کیا آگے نہیں؟ لیکن یہ کتنی عجیب بات تھی۔چونکہ سب کچھ ہی بے معنی ہے۔لاحاصل ہے تو رک جانا بھی بے معنی، لاحاصل ہے۔

چار چکر پورے ہوگئے اور پھر ساڑھے چار۔اور پھر جیسے کوئی تند و تیز طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور امینہ حیران تھی۔یہ طوفان کہاں سے اٹھا ہے؟ اس کی نگاہیں شوہر کو تلاش کر

رہی تھیں۔ وہ کیا ہوا؟'' خلیق چلایا۔ اس نے امینہ کو ڈھیر ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ معاملے کو سمجھ نہیں سکا۔ امینہ سرد فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ بے نقاب تھا اب اس کے ہاتھ شال سے اسے ڈھانپنے کے قابل نہ رہے تھے۔

رحیمہ کلثوم کے ساتھ مل کر بانس کی دیوار کی دراڑوں سے یہ سارا کھیل دیکھ رہی تھی۔ اس نے طے کر رکھا تھا کہ جونہی یہ تقریب ختم ہوگی وہ امینہ کو گھر لے آئے گی اور مٹھائیوں سے اس کی تواضع کرے گی جو اس نے خاص طور پر امینہ کے لیے تیار کی تھیں تاکہ وہ اپنا طویل روزہ کھول سکے۔ اسے گرتا دیکھ کر رحیمہ کا دل بھر آیا اور خلیق کی موجودگی کے باوجود کلثوم کے ساتھ بھاگ کر وہ اندر آئی۔ دونوں امینہ کو اٹھا کر گھر لے گئیں۔ جب وہ اسے ڈنڈا ڈولی کر کے لئے جا رہی تھیں جو اصل میں مردہ بنی لٹک رہی تھی۔ برہنہ ہوگئی تھی۔ خلیق بدحواس ہو کر فوراً آگے بڑھا اور اس کی ساڑھی نیچے تک کھینچ دی۔

ایک لفظ کہے بغیر مجید اور خلیق دونوں بیٹھ گئے۔ تاہم چند لمحوں بعد مجید اٹھا اور ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ خلیق اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا مجید نے حقہ سلگایا اور کش لگانے لگا۔ جب وہ خاصا دھواں دینے لگا تو اس نے حقے کا رخ خلیق کی طرف کر دیا۔ دونوں خاموش رہے۔

مجید اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس غیر متوقع تبدیلی نے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اسے اس وقت کا غصہ یاد آیا جب اس نے پہلی بار پیر سے دم کیا ہوا پانی حاصل کرنے کے بارے میں امینہ کی خواہش کا ذکر سنا تھا۔ اس بات پر اسے شدید طیش آیا تھا کیونکہ محبت پور کے اس قدر قریب آ کر پیر نے پہلے ہی اسے پریشان کر رکھا تھا۔ سب لوگ اس کی طرف ہی بھاگے جا رہے تھے۔ اسی وجہ سے وہ امینہ کو سزا دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کبھی کبھی لوگوں پر سختی کرنی چاہیے۔ انہیں دہشت زدہ کرنا چاہیے۔ ان پر گرجنا برسنا چاہیے۔ ہاں جو یقین نہیں رکھتے۔ ان کا انجام عبرت ناک ہوگا!

اسی زاویئے سے اس نے منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ امینہ کو مزار کے گرد چکر لگانے دے گا اور پھر اسے رکنے کو کہے گا۔ یقیناً اسے دردِ زہ کا احساس نہیں ہوگا۔ پھر وہ خلیق سے کہے گا کہ اس کی بیوی ناقابل علاج ہے۔ یہ کہ اس کے بطن میں اس قدر کنڈل ہیں کہ انہیں ختم کرنا محال ہے اور یہ کہ اس کی سزا جاری ہی رہے گی۔ لیکن اس امکان پر تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑے گی۔ خیر صورت حال اب بھی بالکل ناموافق نہ

تھی۔تاہم اس سے نمٹنے کے لئے اوراس کے ڈرامائی امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لئے نئی چالوں کی ضرورت ہوگی لیکن یہ کیونکر ہوگا؟ ابھی اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔

خلیق نے حقہ رکھا اور بول ہی پڑا ''دن بھر کے روزے نے اسے نڈھال کر دیا تھا''۔

مجید نے کچھ نہ کہا۔البتہ اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ یہ بات اسے پسند نہیں آئی۔

طویل خاموشی کے بعد خلیق نے بالآخر ہچکچاتے ہوئے دوبارہ زبان کھولنے کی جرأت کی ''شاید وہ سہم گئی تھی''۔

مجید نے اتنا لمبا اور گہرا سانس لیا کہ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔پھر بہت افسوس بھرے لہجے میں کہا ''تم ایک ذہین آدمی ہو گنوار تو نہیں ہو۔ایسی باتیں کیوں کہہ رہے ہو؟''

اچھا اگر میرے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہے تو بھئی معاف کر دینا۔'' حیرت زدہ خلیق نے کہا۔

''تم کہتے ہو کہ وہ روزے اور خوف کے سبب بے ہوش ہوگئی تھی یہ سبب آخر کیوں کر ہوسکتا ہے؟ کیا میں نے اسے جسم پر ملنے کے لئے دوپہر کو دم کیا ہوا پانی نہیں دیا تھا؟ اور کیا مزار کے طواف لگانے سے پہلے میں نے اسے پینے کے لیے دم کیا ہوا پانی نہیں دیا تھا؟ اس سب کا مقصد اس بی بی میں طاقت پیدا کرنا ہی تھا نا؟ ''نہیں بات کچھ اور ہی ہے''۔

دونوں پھر خاموش ہوگئے۔مجید نے سوچا کہ یہ دنیا بھی کس قدر عجیب ہے انسان پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے پھر دکھ اٹھاتا ہے، لالچ شہوت، خواہش اور بیماری کا شکار ہوتا ہے اور پھر مر جاتا ہے اس زمیں پر اَن گنت رینگنے والے کیڑوں کی طرح اڑنے والی اور تیرنے والی مخلوقات کی طرح انسان بھی مر جاتا ہے لیکن وہ مخلوقات سوچ نہیں سکتیں جب کہ انسان سوچ سکتا ہے سوچ کی صلاحیت انسان کے لیے خاص عطیہ خداوندی ہے لیکن چونکہ انسان سوچ سکتا ہے اس لیے اسے دکھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔وہ خوش ہو تو بھی دکھ اٹھاتا ہے کیونکہ وہ ایسی چیزوں کے بارے میں سوچتا ہے جن کے بارے میں اسے نہیں سوچنا چاہیے۔لہٰذا ایسا ہے کہ خدا انسان کو مصیبت میں ڈالتا ہے اور ہر انسان کو اپنے ہم جنسوں کو مصیبت میں مبتلا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔بے شک۔بے شک خالق کی یہ دنیا عجیب وغریب ہے ہاں واقعی عجیب وغریب ہے کبھی کبھی خود کو بچانے کی خاطر دوسروں کو مصائب کے

حوالے کرنا پڑتا ہے۔ بے شک یہ الفاظ کس قدر سچے ہیں جو ایمان نہیں رکھتے ان کا انجام عبرت ناک ہوگا۔

دل ہی دل میں وہ ہنسنے لگا۔ ہے یہ سب کچھ مضحکہ خیز۔ اس پر تو ہنسا بھی جا سکتا ہے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ یہی ناں کہ ہر آدمی صرف اپنے لئے جیتا ہے ہم سب تنہا ہیں۔ سب کے سب اس سفاک کٹھور دنیا میں بے رحم اور جفا شعار دنیا میں ہر انسان تنہا ہے۔

اس کے پاؤں کے نظارے نے مجید کے دل میں ہلچل پیدا کی تھی لیکن وہ پاؤں کبھی اس کے آنگن میں نہیں اتریں گے۔ تو پھر آخر وہ بھی کیوں لطف و کرم سے کام لے وہ کیوں اپنے جذبوں سے مغلوب ہو؟

وہ پراگندہ خیالی کا شکار رہا۔ الجھے الجھے بے ربط خیالات۔ تاہم اسے اس بات کی پروا نہ تھی کیونکہ اسے امید تھی کہ اس پراگندگی میں کوئی نہ کوئی نکتہ ایسا بھی مل جائے گا جو اسے ایک نیا منصوبہ تیار کرنے کے قابل بنا دے گا۔

خلیق کسی اور ہی عالم میں تھا۔ وہ نہ تو حوصلہ ہار رہا تھا اور نہ ہی اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ کنکھیوں سے مجید کی طرف دیکھ لیتا۔ مجید خاموش تھا اور اس کی اداس نگاہیں دروازے سے باہر بھٹک رہی تھیں۔ چاند درختوں کے اوپر اٹکا ہوا تھا اور ہوا پتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

خلیق نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

وہ اچھا تو پھر وہ بے ہوش کیوں ہوئی؟''

مجید نے رخ اس موٹے آدمی کی طرف کیا جو بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

''میں ایک ایسی بات سوچ رہا تھا جس نے مجھے غمگین کر دیا، میں سوچ رہا تھا کہ کبھی کبھی خدا بھی بے رحم ہو جاتا ہے۔ کوئی کہاں تک ضبط کر سکتا ہے؟ انسان کی برداشت کی حد کیا ہے؟''

مجید ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

خلیق کے ذہن میں ایک شبہ سرسرانے لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی بے چینی پیدا ہو گئی۔ مجید کو اس کا احساس ہو گیا، لیکن وہ جلد باز نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ معاملے کو آہستہ آہستہ آگے بڑھانا چاہیے۔

باہر کھیتوں میں شبنم گرنے لگی تھی اور چاند دھند میں کھو گیا تھا۔ اندر کمرے میں تیل کا دیا جل رہا تھا اور اس کی لو یوں کانپ رہی تھی جیسے وہ تازہ تازہ لال لہو کا قطرہ ہو۔ مجید گو بظاہر اداس دکھائی دے رہا تھا لیکن اندر وہ شانت تھا۔ خوشی یا غمی کسی کا اسے احساس نہ تھا۔ اس نے المیے کو قبول کر لیا تھا۔ المیہ جس سے بچنا محال تھا۔

اچانک خلیق بے قابو ہو گیا۔ وہ یک دم اٹھا اور مجید کے ہاتھوں کو گرفت میں لے کر کہنے لگا۔

''کیوں؟ بتاؤ نا وہ کیوں بے ہوش ہوئی؟''

مجید نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ہلکی سی ملامت کا اشارہ تھا۔ تاہم لگتا تھا کہ اس نے یہ بات مان لی تھی کہ اس شخص کے بے صبر ہونے کا مناسب جواز موجود ہے۔ دکھ بھری آواز میں وہ کہنے لگا ''کبھی کبھی جہالت اور بے خبری میں انسان زیادہ خوش رہتا ہے''۔

خلیق کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ خاموش رہا۔ مجید منتظر رہا لیکن جب خاموشی بڑھ گئی تو اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔ وہ کہنے لگا ''مجھے ڈر ہے کہ جو کچھ میں کہنے لگا ہوں اس سے تمہیں رنج پہنچے گا۔ لیکن مجھے کہنا ہی ہوگا۔ درویش جو یہاں آرام کر رہا ہے اس سے خوش نہیں ہے۔''

وہ رکا۔ خلیق پر ایک نگاہ ڈالی، اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی حیرت کا جائزہ لیا اور دوبارہ کہنے لگا ''خدا نے ہر مسلمان کو تیس روز تک روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ مسلمان روزے رکھتا ہے لیکن وہ محض روزے کے سبب کبھی بیہوش نہیں ہوتا۔ تمہاری بیوی اس لئے بے ہوش نہیں ہوئی کہ اس نے ایک دن کا روزہ رکھا تھا بلکہ تم نے سچ ہی کہا تھا کہ وہ خوف زدہ تھی۔ ہاں اندر ہی اندر وہ خوف کھا رہی تھی۔ یعنی اپنی ان گہرائیوں میں جہاں دم کیا ہوا پانی جا پہنچا تھا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب دم کیا ہوا پانی اس کے جسم میں اتر گیا تو وہ درویش کے حضور حاضر ہوئی؟ وہ اس کے روبرو تھی اور درویش کا قہر اس کی برداشت سے باہر تھا۔ کوئی گناہ گار بھی جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہو۔ درویش کے قہر کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اس نے بھی کوئی نہ کوئی بڑا گناہ کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ گناہ کیا تھا۔ نہ یہ بتا سکتا ہوں کہ کب کیا تھا۔ یہ طے کرنا میری قوت سے باہر ہے۔ درویش مجھے سب کچھ نہیں بتایا کرتا۔ تم خود ہی پتہ کر سکتے ہو''۔

مجید نے حقہ واپس لے لیا۔ آگ سرد ہو چکی تھی۔ چند بے سود دم لگانے کے بعد بھی اس کا چہرہ ہیبت ناک ہی تھا۔ وہ کہنے لگا ''اب تم اسے گھر لے جاؤ''۔ خلیق بدھو بنا بیٹھا تھا۔ مجید نے اسے دیکھا، ٹھنڈی آہ بھری اور اداس لہجے میں کہنے لگا ''یہ تو ہوتا ہی ہے۔ نیک آدمی کو اس گناہ کی سزا بھگتنا پڑتی ہے جو اس نے نہیں کیا ہوتا''۔

باب نمبر 12

صحن کے ایک کونے میں بڑا سا بے ہنگم کٹھل کا درخت تھا۔ تربوز جیسا بڑا بڑا پھل بس پکنے ہی کو تھا جلد ہی اس پر وہ رنگ آئے گا کہ جوانوں کے منہ میں اسے دیکھ کر پانی بھر بھر آئے گا۔ گھر کے برآمدے میں بیٹھا خلیق خیالوں میں گم حقہ کے دم لے رہا تھا۔ اس کی نظریں کٹھل پر جمی تھیں لیکن وہ حقیقتاً انہیں دیکھ نہ رہا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور کھویا ہوا تھا۔

بیوی سے وہ پوچھ نہیں سکتا تھا..... ہاں یہ تو ممکن نہیں تھا۔ لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ سچ کو جاننے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔ کوئی نشان، کوئی سراغ بھی نہ تھا، اس کے چال چلن کے بارے میں تو کبھی حاسدوں نے بھی کوئی افواہ نہیں اڑائی تھی۔ یہ سارا معاملہ بس اچانک ہی پیدا ہو گیا تھا۔ امینہ کا ماضی اسی طرح روشن تھا جس طرح سورج کی روشنی میں سمندر روشن ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا کہ اس پر پردہ پڑا ہو اور اس پر شک کیا جا سکے۔ مگر پھر اس کے دل میں مانا کہ وہ اس کے ماضی کو ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا خیر تو اس سے کوئی مفر نہیں تھا اس سے پوچھنا ہی پڑے گا۔

ایک ملازم پاس بیٹھا کٹھل کو دیکھے جا رہا تھا محض اس لئے کہ اس کا آقا بھی بظاہر انہیں دیکھ رہا تھا۔

''بعض تو خوب پک گئے ہیں'' اس نے کہا ''وہ دو نیچے والے'' خلیق کچھ بڑبڑایا اور پھر جلدی سے حقہ کے دم لگانے لگا۔ اس کے دل میں تو یہ بے قراری تھی کہ وہ امینہ سے سارا ماجرا کیونکر پوچھے گا؟ شوہروں کو بیویوں سے بات کرنے کے مواقع تو کم ہی ملتے ہیں۔ ان کی دنیا میں الگ الگ ہوتی ہیں اور ان کی راہیں شاذ و نادر ہی ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ خصوصاً ایسی بیوی سے بات کرنا تو اور بھی دشوار تھا جو الگ بستر پر سوتی

ہو۔ اگر دوسری بیوی تانو کا معاملہ ہوتا تو شاید اس قدر دشواری پیش نہ آتی۔ وہ اندھیرے میں بلا تکلف اس سے بات کر سکتا تھا۔

پھر بھی معاملے کی تہہ تک پہنچنا ہوگا اور اس کا ایک ہی طریقہ تھا یہ کہ اس سے پوچھا جائے۔ اس نے خود سے کہا مجھے پتہ چلنا چاہئے۔ اگر اس نے اقرار نہ کیا تو پھر مشکل پیدا ہو جائے گی۔ اس کے ذہن کو کبھی سکون نہ ملے گا۔ کبھی چین نصیب نہ ہوگا۔ دل میں کانٹا کھٹکتا رہے گا۔

اگر اس نے بات کا اقرار کر لیا تو بھی ایک مسئلہ باقی رہ جائے گا۔ اگر اس کا جرم سنجیدہ نوعیت کا ہوا تو پھر ظاہر ہے کہ مناسب بات یہی ہوگی کہ اسے اس کے والدین کے پاس واپس بھیج دیا جائے۔

اس سہ پہر کو جب وہ گھر واپس گیا تو اپنی لکڑی کی کھڑاؤں سے خوب کھٹ کھٹ کی۔ زور سے کھانسا، تھوکا اور نوکرانی کو ڈانٹا پھٹکارا کہ مرغا کیوں جنگلے پر بیٹھا بانگ دے رہا ہے اور پر پھڑ پھڑا رہا ہے۔ پھر وہ جلدی سے امینہ کے کمرے میں داخل ہو گیا وہ بستر پر لیٹی تھی۔ زرد اور بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ تانو اس کا ہاتھ پکڑے کونے پر بیٹھی تھی۔ پلنگ کے ساتھ لگ کر غمگین چہرے والی ایک ملازمہ پنکھا جھل رہی تھی۔

تانو نے ساڑھی کا پلو سر پر کھینچ لیا اور خلیق کی طرف نظریں کئے بغیر کہنے لگی ''بہت بیمار ہے میری بہن۔ اس نے کچھ بھی نہیں کھایا''۔

خلیق نے زور لگا کر گلا صاف کیا اور بے نیازی کا بہانہ کرتے ہوئے کہنے لگا ''میں اس سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں''۔ دوبارہ اس نے گلا صاف کیا۔

تانو اور ملازمہ باہر چلی گئیں تو خلیق پلنگ پر امینہ کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ قدرے سمٹ گئی تاکہ وہ اس سے چھو نہ جائے۔ کیونکہ اس بات کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ چند لمحوں بعد وہ اٹھا اور فرش پر پڑے ہوئے پاندان سے پان کا پتا اٹھایا۔ دوبارہ بستر پر بیٹھ کر اس نے چند لمحے اسے غور سے دیکھا پھر گھبراہٹ سے کھانستے کے بعد اس نے بات شروع کی ''مجھے بتاؤ بی بی، یہ سارا معاملہ کیا ہے؟ کل شام سے میں بہت بے چین ہوں''۔

امینہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ ڈھیر سارے وسوسوں نے اسے بھی پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے بیمار چہرے نے پریشانی کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

پان کا پتا منہ میں رکھ کر خلیق برہمی سے اسے چبانے لگا۔

''میں نے دوسری شادی اس لئے کی تھی کہ تم مجھے کوئی بچہ نہ دے سکی تھیں'' وہ کہنے لگا ''اور خدا کی منشاء یہ ہے کہ انسان بچے پیدا کرے لیکن میں ہمیشہ تمہارا بے حد احترام کرتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ میری دوسری بیوی کی موجودگی سے تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے اور نہ ہی کسی طرح تمہاری توہین ہو۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟ اور وہ تمہارے ساتھ اچھی ہے۔ میں یہ بات جانتا ہوں۔ ہاں اس کی فطرت کچھ مختلف ہے۔ شاید وہ کسی قدر غیر سنجیدہ ہے۔ باتیں بھی بہت کرتی ہے اور بہت سا زیور پہنتی ہے لیکن دل کی بری نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟''

امینہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

''شاید میں نے تم سے زیادہ اس پر محبت نچھاور کی ہے لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ابھی بہت جوان ہے۔ ہر کوئی جواں شے سے کھیلنا پسند کرتا ہے اصل میں یہ ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے لیکن میں نے کبھی تمہیں پیار کرنا اور تمہاری عزت کرنا نہیں چھوڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر کوئی تمہیں چاہتا اور تمہارا احترام کرتا ہے۔ کسی نے آج تک تمہارے بارے میں کوئی غلط لفظ منہ سے نہیں نکالا۔''

ایک پل کے لئے وہ چپ ہو گیا۔ پھر چپکے سے اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر کہنے لگا ''کل رات میں اس لئے تم پر چلایا تھا کہ میں پریشان تھا۔ لیکن یہ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ تھی ناں؟ اس کے لئے تم مجھے معاف کر دو''۔

آنکھیں کھولے بغیر امینہ خاموشی سے بڑبڑائی ''معافی مانگ کر تم سے کرو۔ یہ مناسب نہیں ہے''۔

اس کی آواز سن کر خلیق کو حوصلہ ہوا۔

''خیر مجھے یہ تو کہنا ہی چاہیے کہ یہ میری غلطی تھی۔ ٹھیک ہے ناں؟ لیکن میں پریشان بھی بہت رہا ہوں۔ مجھے تسلیم کرنا چاہیے کہ تم سے کوئی برائی منسوب کرنے کا خیال بھی میرے لئے محال ہے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم خود ہی مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا کیا ہے تاکہ میرے دل کو دوبارہ سکون مل سکے۔''

آنکھیں کھول کر امینہ نے تھوڑی دیر کے لئے سامنے کی طرف نظریں گاڑ دیں ''میں کچھ نہیں جانتی'' اس نے بالآخر کہا۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ باہر صحن میں ایک بچھڑا اودھم مچاتا ہوا ماں کی

طرف بڑھا۔ باہر قریب کے کھیتوں میں کوئی گائے ڈکارنے لگی۔ خلیق پلنگ کے کنارے پر بیٹھا فرش کو گھور رہا تھا۔

''بی بی'' اس نے نرمی سے کہا۔

امینہ نے آنکھیں کھولیں، لیکن شوہر کی طرف نہ دیکھا۔

''بی بی ہوسکتا ہے کہ انجانے میں تم سے کوئی غلطی ہوئی ہو۔ شاید یہی سبب ہے۔ ذرا سوچنے کی کوشش کرو۔ یاد تو کرو۔ یاد تو کرو کہ کیا ہوا تھا''۔

کئی لمحوں تک خلیق پان چباتا رہا۔

''تمہارے گھر والے اچھے لوگ ہیں ان کے بارے میں بھی کبھی کسی نے برا لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ وہ نیک، دیانت دار اور تمہاری طرح شفیق لوگ ہیں۔

''ان کے متعلق بھی سوچو''۔

ماں باپ کا خیال آتے ہی لگتا تھا کہ امینہ آنسوؤں سے پھٹ پڑے گی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ آنسو چھپانے کے لئے اس نے ہاتھ آنکھوں پر رکھ دیے۔

کچھ دیر اور خلیق بیٹھا رہا لیکن بالآخر وہ اٹھا اور چلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ اور کیا ہے۔ بیوی سے اس کا راز کیونکر اگلوانے یا اسے اپنا جرم یاد کرنے میں کس طرح مدد دے۔

تھوڑی دیر بعد امینہ نے اسے بلا بھیجا۔ وہ فوراً آیا اور بے قراری سے پوچھنے لگا ''اچھا تو تمہیں یاد آ گیا ہے؟''

پل بھر کے لئے امینہ کچھ سوچتی ہوئی دکھائی دی۔ پھر غم آلود ہلکی آواز میں بستر پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے کہنے لگی ''مجھے معاف کر دو کہ میں تمہارے لئے پریشانی اور تشویش کا باعث بنی ہوں''۔

اس کا بھید جاننے کے اشتیاق میں خلیق نے یہ بات سنی اَن سنی کر دی۔ لیکن چونکہ وہ دوبارہ خاموش ہوگئی۔ اس لیے وہ بالآخر کہہ اٹھا ''ہوں''۔

''میں نے بہت سوچا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا''۔

''تمہیں یاد کیا آتا ہے''۔

''یہ کہ کبھی کبھی مجھ سے نماز چھوٹ جاتی ہے۔''

''خیر یہ کوتاہی تو سب سے ہوتی ہے''

''بچپن میں میں میٹھے چاول چرا لیا کرتی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھے لگتے تھے''۔ وہ ہچکچائی اور اس کے زرد چہرے پر حیا کی لہر دوڑ گئی۔ ''پھر ایک بار جب میں بالغ ہو چکی تھی تو میں نے قرآن کو اس وقت ہاتھ لگایا تھا جب میں پاک نہ تھی۔ بس یہی کچھ ہے۔ کچھ اور تو مجھے یاد نہیں'' وہ رکی اور پھر نرمی سے کہنے لگی ''اچھا تو کیا یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ خدا ہی ناراض ہو جائے؟''

خلیق کو بظاہر مایوسی ہوئی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے فرش کو گھورنے لگا۔ وہ پھر سے کہنے لگی۔

''ایک اور بات بھی ہے۔ کبھی کبھی بچوں کی وجہ سے مجھے بہن تانو سے جلاپا ہوتا ہے۔ میرے دل میں اس سے درد، عجب سا درد اٹھتا ہے۔ لیکن نہ تو میں نے کبھی ناخوشی ظاہر کی ہے اور نہ ہی اس کے سامنے اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے۔ اگر میں خود پریشان ہوں تو اسے کیوں کروں؟''

دوبارہ زبان کھولنے سے پہلے وہ کئی لمحوں تک خیالوں میں گم رہی۔ اس کی آواز کمزور اور بے جان سی تھی۔

''میں نے پوری کوشش کی ہے۔ پوری زندگی کی ہر تفصیل کو یاد کرنا چاہا ہے لیکن شاید قرآن والی بات ہی ہے۔ ناپاکی کی حالت میں اسے چھونا غلط ہی تھا۔ لیکن میں بہت چھوٹی تھی اور ان باتوں کی مجھے سمجھ نہ تھی۔ پھر بھی یہ گناہ ہی تھا۔ نہیں؟ بہت بڑا گناہ؟''

ایک مرتبہ پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ گھومتی پھرتی ایک بلی ہولے سے کمرے میں آ گئی اور دروازے سے دونوں کو دیکھنے لگی۔

''اچھا تو تمہیں کچھ یاد نہیں؟''

''نہیں''

''کچھ بھی نہیں؟''

''نہیں''

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا ''ہو سکتا ہے کہ میں نے کوئی ایسی بات کی ہو جو بہت بڑا گناہ تھی لیکن اب مجھے یاد نہ ہو۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟

خلیق جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں'' اس نے کہا

''خیر سزا تو مجھے مل ہی چکی ہے۔ ہے ناں؟ میں کبھی ماں نہ بن سکوں گی''۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں'' خلیق نے دوبارہ جواب دیا۔

ہاں اس کے خیال میں یہ خدا کی طرف سے سزا ہی تھی۔ اس کا درماندہ، ناتواں جسم کانپ کر رہ گیا۔ جب خلیق اٹھ کر چلا گیا تو اسے تنہائی۔ شدید تنہائی کا احساس ہوا۔ کیا جہنم میں بھی ایسی ہولناک تنہائی میں دکھ اٹھانا پڑیں گے۔ وہ سوچنے لگی۔

مجید کے ڈیرے پر بیٹھ کر خلیق اپنے میزبان کے خوب سلگنے والے حقے کے اداسی سے دم لگا رہا تھا۔ حقے کی نے مجید کو تھماتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں نے اس سے پوچھا ہے لیکن اسے کوئی اہم بات یاد نہیں سوائے اس کے بچپن میں وہ اپنی پسند کی میٹھی چیزیں چرایا کرتی تھی اور یہ کہ ایک بار عورت بننے کے بعد اس نے ناپاکی کی حالت میں قرآن کو چھولیا تھا لیکن اس وقت وہ کافی چھوٹی تھی۔ باقی یہ کہ وہ میری دوسری بیوی سے حسد کرتی ہے۔ بس یہی کچھ ہے''۔

''ہوسکتا ہے کہ اسے کچھ یاد نہ رہا ہو'' مجید نے کہا ''انسان بھول بھی تو جایا کرتا ہے۔ ذہن ان باتوں کو جھٹک دیتا ہے۔ جن سے انسان کو گناہ گار ہونے کا احساس ہو یہی وجہ ہے کہ گناہ گار اکثر گناہ گار ہی رہتا ہے جو بات اسے یاد ہی نہیں اس کی تلافی وہ کیسے کرسکتا ہے؟ لیکن میں ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ مزار کھری کسوٹی ہے۔ مزار جھوٹ نہیں بولتا''۔

خاموشی کے طویل وقفے کے بعد خلیق نے پوچھا ''اچھا تو اب میں کیا کروں؟''

''تم کیا کر سکتے ہو؟ اپنے گناہ کی تلافی تو وہ خود ہی کرسکتی ہے۔ اسے وقتاً فوقتاً مزار پر حاضری دینے کے لئے کہو''۔

''لیکن کیا وہ پہلے ہی سزا نہیں بھگت رہی؟'' فرش سے نگاہیں اٹھائے بغیر خلیق نے کہا۔

سزا؟ سزا کیسی؟ مجید نے پوچھا۔ اس کی آواز میں غصے کا انداز تھا۔ ''وہ اس لئے دکھ اٹھا رہی ہے کہ وہ اپنی توہین کا احساس رکھتی ہے۔ اپنے گناہ کی تلافی اس نے نہیں کی''

خلیق کے جانے کے بعد مجید اکیلا بیٹھا حقہ پھونکتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی آگ راکھ میں تبدیل ہوگئی۔ دوخوبصورت اور ملائم پیروں کا تصور اس کے ذہن میں کھلبلی مچاتا رہا اور وہ محرومی کی آگ میں جلتا رہا۔ اپنی چلم میں اس نے راکھ کے ڈھیر کو دیکھا اور کہہ

اٹھا ''ایمان کے سوا سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔صرف ایمان ہی ہمیں زندہ رکھتا ہے''۔

غور وفکر کے اس سنجیدہ عالم میں وہ اندر چلا گیا۔سونے سے پہلے اس نے خود سے سرگوشی کی ''ایمان کی حفاظت ضروری ہے۔اسے بچانے کے لئے کبھی کبھی انسان کو اپنی منتخب راہ کے خاتمے تک چلنا چاہئے۔ یہاں معصوم لوگ بھی دکھ اٹھا سکتے ہیں۔لیکن اس کا اجر انہیں بہشت میں مل جائے گا''۔

باب نمبر 13

اس رات ہر کوئی سو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہلکی سی آہٹ پر بے قابو ہو جانے والے خلیق کا ہر دم خبردار رہنے والا کتا بھی بے خبر سویا ہوا تھا۔ ایسے میں امینہ اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور چیخنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ دوپہر ہو چکی ہے۔ اس نے سیاہ رنگ کا نوکدار سینگوں والا غضب ناک بیل دیکھا جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ اور چہرہ بگڑ گیا۔ وہ چلانے لگی..... ''روکو اسے، روکو اسے، کیا تم روک نہیں سکتے ہو؟''

پاگلوں کی طرح وہ اندھرے میں نوکروں اور گھر کے دوسرے لوگوں کو ڈھونڈنے لگی۔ پھر اس کی سرگوشی ابھری ''سب کہاں چلے گئے ہیں؟ یہاں اس قدر اندھیرا کیوں ہے؟''

تمام صاحب جائیداد لوگوں کی طرح خلیق کی نیند بھی کچی تھی۔ وہ شیخی بگھارتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ درخت سے گرنے والے پتے کی آواز پر بھی وہ جاگ سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راتوں کو بدروحیں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ جہاں تک خلیق کا تعلق ہے اس کے لئے صرف چوروں اور ڈاکوؤں کا ہی وجود تھا۔ اس لئے وہ نہ صرف آنکھوں اور کانوں کو خبردار رکھ کر سوتا تھا بلکہ اپنے بستر کے پاس بھری ہوئی دونالی بندوق بھی ہمیشہ رکھتا تھا۔ جونہی امینہ کی چیخ سنائی دی اس نے بستر سے اچھل کر بندوق کو ہاتھ میں لے لیا۔ مدد کے لئے اس نے چلانا چاہا لیکن خوف کے مارے اس کے گلے سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

ایک لمحے بعد گھر کا ہر فرد پاگلوں کی طرح ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا اور کتا بھی غیض وغضب سے بھونک رہا تھا جیسے وہ اپنی کوتاہی کی تلافی کرنے کے درپے ہو۔

امینہ نے ان لوگوں کے چہروں کو بغور دیکھا جو ہاتھوں میں لالٹین اور تیل کے

چراغ لئے اس کے پلنگ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ بالآخر اس کی نظریں خلیق کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ خاموشی کے ایک لمحے میں اس نے خلیق کو یوں دیکھا جیسے وہ اس بات کا تعین کرنا چاہتی ہو کہ آیا وہ دوست ہے یا دشمن۔ بظاہر اس نے اسے دوست خیال کر لیا تھا۔ اس لئے غیر معمولی طور پر مضبوط آواز میں کہنے لگی۔ ''میں مزار کے پہلو میں بیٹھی تھی اور اس خوفناک کالے بیل نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ جونہی اس نے تمہیں دیکھا وہ بھاگ گیا''۔

خلیق جو بندوق تھامے اس کے پہلو میں کھڑا تھا، پوچھنے لگا ''کون سا کالا بیل؟

امینہ نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا اور اشارہ کرنے لگی۔

''وہاں'' اس نے بے سانس سرگوشی میں کہا۔ تم صرف اس کا سر ہی دیکھ سکتے ہو۔ وہ یہاں مزار میں کیا کر رہا ہے؟''

اس آدمی کی طرح جسے اچانک خوفناک مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہو، خلیق کے منہ سے چند لمحوں کے لئے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ پھر جب اس نے اپنی زبان پر قابو پا لیا تو چلانے لگا ''میری بیوی پاگل ہو گئی ہے''۔

خلیق کی بڑی خواہش تھی کہ یہ راز ان تینوں تک محدود رہے، لیکن اب جب کہ امینہ دیوانی ہو گئی تھی۔ یہ ممکن نہ رہا تھا۔ جلد ہی گاؤں کے ہر شخص کو اس کے بانجھ پن کے سبب کی خبر ہو گئی۔

''ایسی باتوں کو چھپانا محال ہوتا'' مجید نے نرمی سے خلیق کو بتایا جو رنج و الم کی تصویر بنا اس کے پاس بیٹھا تھا۔ ''گناہ گار اندر سے دکھ اٹھاتا ہے کبھی کبھی اس کا دکھ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ اس کا بھاری بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اور یوں حواس کھو بیٹھتا ہے۔ یقین کرو دوست کہ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ جب کوئی گناہ گار ہمارا عزیز ہو تو پھر تکلیف کم و بیش ناقابلِ برداشت ہی ہو جایا کرتی ہے''۔

خلیق نے کوئی جواب نہ دیا اور مجید اچانک پریشان سا ہو گیا۔ کئی برسوں میں پہلی بار اسے لگا کہ جیسے وہ اس پتلے دھاگے پر چل رہا ہو جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قیامت کے روز ہر شخص خدا کے روبرو اپنے ایمان کی شہادت دینے کے لئے اس پر سے گزرے گا۔ لیکن اب انسان کے سامنے، اپنے ہی گاؤں والوں کے سامنے.....اور خاص طور پر خلیق کے روبرو اسے اس امتحان سے گزرنا تھا۔ مجید کو لگا کہ جیسے وہ جہنم کے شعلوں کے کنارے کھڑا ہو۔

لیکن اچانک وہ تھوڑا سا ہنسا اور پھر خلیق کے زیادہ قریب ہو کر کہنے لگا ''تمہیں پریشانی اس بات کی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے تمہیں بے عزتی کا ڈر ہے..... ہے نا؟ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے خاندان کے نام کو بٹہ لگ گیا ہے؟ وہ رکا اور دوبارہ ہولے سے ہنسا ''تم نے ،اگر میں کہہ سکوں تو، یوں ہے احمق اور خود پسند گدھے جیسا تمہارا طرز عمل ہے، میرے دوست''۔لیکن ایک بار پھر اس کی آواز سنجیدہ ہوگئی۔

''میری بات سنو'' وہ کہنے لگا ''اللہ کے سامنے ہم سب برابر ہیں۔اللہ کی نظروں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔کیا یہ سچ نہیں کہ دولت اور شان وشوکت بالآخر مٹی میں مل جاتے ہیں؟ کیا امیر اور غریب ایک ہی طرح زمین میں واپس نہیں چلے جاتے؟ یقیناً مجھے تو اس معاملے میں خدا کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔تم اسے چھپانا چاہتے تھے۔لیکن سب کو اس کی خبر ہوگئی ہے۔بلاشبہ یہ خدا کی طرف سے اس امر کی خبرداری ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھے۔ذرا یہ دیکھو کہ خدا نے دولت کے بجائے تمہارے غرور پر چوٹ لگائی ہے۔ تمہارا گھر،تمہاری زمین،تمہارا اناج اور تمہارے مویشی سب ویسے کے ویسے ہی ہیں وہ بالکل محفوظ ہیں، ہیں نا؟''

خلیق اپنے افسردہ خیالات سے چونک پڑا۔مجید کے آخری الفاظ کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا ''ہاں یہ سچ ہے، بالکل سچ۔جیسے تم کہتے ہو اس نے میرے غرور پر چوٹ لگائی ہے۔میری حقیر جائیداد پر نہیں۔واقعی یہ کس قدر سچ ہے؟''

جس قدر زیادہ وہ مجید کے الفاظ پر غور کرتا اتنا ہی وہ ان کی اہمیت سے متاثر ہو رہا تھا۔وہ اٹھا، آگے جھکا اور مجید کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔اس کا سانس اکھڑا ہوا تھا پریشان ہو کر کہنے لگا ''خدا کے لئے میرے لئے دعا مانگو۔میں نہیں چاہتا کہ جو میری چھوٹی موٹی جائیداد ہے اس پر اس کا قہر نازل ہو''۔

مجید نے لمبا اور گہرا سانس لیا۔پھر ملائمت سے کہنے لگا ''پیارے دوست میں تو ہمیشہ تمہارے لئے دعا کرتا ہوں''۔

خلیق کی پریشانی کم ہونے لگی اور پراگندہ خیالی کا بوجھ ہلکا ہونے لگا۔جلد ہی ایسا نظر آنے لگا اس نے نہ صرف اپنے خوف پر قابو پا لیا ہے بلکہ یہ بھی طے کر لیا ہے کہ سب سے پہلے اسے اپنے مال ودولت کی حفاظت کو یقینی بنانا چاہیے۔

اب وہ اپنی جائیداد کے فرض کو ایک ایسا عظیم اور شریفانہ فرض سمجھنے لگا تھا جس

کے آگے دوسری تمام چیزیں ہیچ تھیں۔ضمیر کی کسی خلش یا رحم کو اس فرض کی راہ میں رکاوٹ نہ بننا چاہیے۔

اس کا عزم آہستگی سے الفاظ کا روپ دھانے لگا تھا کہ اس کا رخ پھر اس نے تاریک اندھیرے گوشے کی طرف مڑ گیا۔ جو ہر شخص کے ذہن میں موجود ہوتا ہے، اور جہاں ظالمانہ اور خودغرض فیصلے کئے جاتے ہیں۔ وہاں اس نے خاموشی سے ان الفاظ کا جائزہ لیا اور یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ جب انہیں ادا کیا جائے گا تو وہ کیسے لگیں گے۔ وہ دوبارہ زبان تک آئے، لیکن ہچکچاہٹ کے سبب اس نے ایک لمحے کے لئے انہیں روک لیا۔ پھر زبان کی ہلکی سی تھرتھراہٹ کے ساتھ اس نے کہہ ہی دیا۔''اب امینہ کو اپنے گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ میں اسے بھیج دوں گا''۔

مجید اس اچانک فیصلے سے حیران ہوا لیکن اس نے اپنی حیرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس قسم کا اقدام تو اس کے دھیان میں آیا ہی نہیں تھا۔ لیکن اب سننے کے بعد یہ سخت سزا اب تک ہونے والے واقعات کا فطری نتیجہ دکھائی دینے لگی۔ جو کام آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتے وہ ایک منطق کے تحت انجام کو پہنچتے ہیں۔ دریا سمندر میں جا کر گرتا ہے، بادل برستے ہیں اور گناہ سزا کی طرف لے جاتا ہے۔

''شاید یہ بہتر ہی ہوگا'' اس نے جواب دیا۔

خلیق کو موہوم سی امید تھی کہ مجید کسی قدر کم سخت حل پیش کرے گا۔ اسے یہ سن کر مایوسی تو ہوئی مگر اس نے اس مایوسی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''لیکن کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ اس کا گناہ کیا ہے'' وہ بڑبڑایا۔

مجید اس جملے پر غور کرنے لگا۔ شاید وجدانی طور پر اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ خلیق کیا چاہتا ہے۔ شاید وہ خود بھی کم ظالمانہ سزا کو ترجیح دیتا۔ لیکن اسے یہ کہنا چاہیے؟

''گناہ کا مطلب محض دھوکا دینا، چوری کرنا یا جھوٹ بولنا نہیں'' سر ہلاتے ہوئے مجید نے اعلان کیا۔''یہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ایک پاکباز شخص بھی خدا کی نظروں میں گناہ گار ہو سکتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں سے کسی شخص کا سلوک مناسب ہو تو بھی وہ خدا کی ناراضگی کا سبب بن سکتا ہے۔ خدا سب کچھ دیکھنے والا ہے اور وہ ہماری زندگی کے ہر لمحے میں ہماری نگرانی کرتا ہے۔ وہ ہمارے ظاہر اور پوشیدہ ہر قسم کے اعمال کا سچا مصنف ہے۔ وہ ہمارے بولے جانے والے اور اَن کہے الفاظ اور خیالات کو بھی جانتا ہے''۔

تھوڑی دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے، ان کے درمیان ایک باہمی قرب کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ باہمی رابطے کا ایک عجب سا احساس انہوں نے گویا مل جل کر کوئی کارنامہ انجام دیا تھا۔مل جل کر ایسا کام کرنے کا ارادہ کیا تھا جسے کرنا آسان نہ تھا۔لیکن جسے بہرطور کرنا ہی تھا۔اب اس کی اچھائی یا برائی سے ان کو تعلق نہیں تھا۔

آخر خلیق نے مہرسکون کو توڑا۔مگر لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا جیسے جو تجویز پیش کرنے والا ہے اس میں خلوص قلب تک کی کمی ہو'' کچھ عرصے سے مجھے رہ رہ کر ایک خیال آرہا ہے۔

''کیا''؟

''ہمارے گاؤں کو ایک چیز کی ضرورت ہے۔ یہاں کوئی مناسب مسجد ہی نہیں اس ٹین کی چھت والی مسجد کا خیال آتے ہی شرم محسوس ہوتی ہے۔''

''اچھا تو پھر؟''

''اچھا تو میں سوچ رہا تھا کہ ایک خوبصورت سی مسجد تعمیر کرنی چاہیے جس میں شاندار مینار ہوں، شاندار گنبد ہوں، اور منبر ہو ویسی جیسی مٹی گنج میں ہے بلکہ اس سے بہتر''۔

''یہ تو بہت ہی نیک خیال ہے، میرے دوست''۔

''شاید ہمیں لوگوں سے چندہ مانگنا چاہئے تاکہ دوسرے لوگ بھی اس کارِخیر میں شریک ہوسکیں۔لیکن اگر تم اتفاق کرو تو مجھے اخراجات کا بڑا حصہ برداشت کر کے خوشی ہوگی''۔

''واقعی یہ بڑا نیک خیال ہے'' مجید نے جوش وخروش سے سر ہلاتے ہوئے کہا ''یہ تو میرا فرض ہے، ہے نا؟''

''ہے تو سہی، لیکن ہم میں سے کتنے اپنے فرض سے آگاہ ہیں؟'' مجید نے جواب دیا۔اس کا دل زمیندار کی دوستی اور اس کے لیے ہمدردی سے بھر آیا تھا۔

''مسجد غالباً مزار کے قریب ہی بننی چاہیے۔میرے نزدیک تو اس سے بہتر مقام اور کوئی نہیں'' خلیق نے اضافہ کیا۔

گہرے جذبات سے مغلوب ہوکر مجید نے تھوڑی سی دعا کی۔اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چمکنے لگی تھیں۔خاموشی سے سنتا رہا اس کا سر احترام سے حق تعالیٰ کے روبرو جھکا ہوا تھا۔

آپس میں جو دوستی کی ایک حرارت پیدا ہوئی تھی اس کے باوجود خلیق کے ذہن میں بار بار امینہ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آیا اس کے بارے میں مزید کوئی بات ہوسکتی ہے۔ دوبارہ اس کا نام لینے کی وہ جرأت نہیں کرسکتا۔ پھر بھی جب وہ اٹھنے لگا تو اس نے بظاہر بے نیازی سے مجید کی طرف دیکھے بغیر پوچھ ہی لیا، ''شاید میرے اس نیک عمل سے میری بیوی کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟''

مجید نے فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ پھر آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ لفظ چن کر اس نے کہا ''نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر شخص خود خدا کے آگے جواب دہ ہے۔ خدا کے روبرو ہر کوئی تنہا ہے۔ اس کے گناہ اور نہ ہی اس کے نیک اعمال کسی اور کو منتقل ہو سکتے ہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مسجد بنوا کر تم اپنی بیوی کے گناہوں کی معافی کا سامان کرسکو گے تو پھر تم غلطی پر ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ خدا کی نظروں میں تمہارے اس نیک عمل کی وقعت بھی ختم ہوسکتی ہے''۔

''اوہو نہیں'' خلیق نے احتجاج کیا ''میرا یہ مطلب نہیں۔ ہرگز یہ مطلب نہیں تھا''۔

ویسے یہ بات واضح تھی کہ صرف اسی توقع پر خلیق نے یہ پیش کش کی تھی۔

سورج تیزی سے چمک رہا تھا۔ درختوں تلے گہرے سائے تھے اور درخت ابھی تک رات کی بارش سے گیلے تھے۔ ایک سجی سجائی پالکی میں، جسے دو تنومند کہار پالکی اٹھا کر بھاری اور متوازن قدموں کے ساتھ چل رہے تھے۔ امینہ کو اس کے والدین کے گھر واپس بھیجا جا رہا تھا۔ خلیق نے اس عورت کے ہمراہ جانے کا فیصلہ کیا تھا جو عورت اور مرد کے مابین رواج کی طے کردہ جدائی کے باوجود برسوں تک اس کے گھر کی رانی رہی تھی اور جو اس کی خوشیوں اور غموں میں برابر کی شریک رہی تھی۔ وہ پالکی کے ساتھ..... چل رہے تھے وہ جلد ہی تھک کر پیچھے رہ گیا۔

اس کے دروازے کے باہر تھوڑی بھیڑ اکٹھی ہوگئی تھی کہ جدائی کا یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ بعض عورتیں اپنے آنسوؤں کو قابو میں رکھنے کی خاطر ہونٹ کاٹ رہی تھیں۔ تانو خالی خالی نظروں سے پالکی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ دور ہوتی چلی جا رہی تھی اور کہاروں کی آوازیں مدھم پڑتی جا رہی تھیں اس نے امینہ کو اس میں بیٹھے ہوئے تصور کیا اور پھر اس کا ذہن اس نامعلوم گناہ کی طرف جانے لگا جس نے اسے کچوکے دے دے کر

پاگل پن کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ اب وہ ایک ایسی طاقت کے حکم پر ہمیشہ کے لئے جا رہی تھی جو سورج سے، چاند سے، دھرتی سے اور ان تمام انسانوں سے بڑی ہے جو اس پر رہتے ہیں۔ اس نے یہ تصور کرنے کی کوشش کی کہ امینہ اس جھولتے ڈولے میں بیٹھی کیسی لگ رہی ہوگی اور کیسے جھونٹے کھا رہی ہوگی۔ اس تصور کے ساتھ ہی گہری تشویش اور گلا گھوٹنے والے احساس نے اسے آ لیا۔ اپنے خیالوں میں اس نے امینہ کو یوں دیکھا کہ جیسے وہ مر چکی تھی آنکھیں بند ہوں اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے ہوں ہاں اب وہ مر ہی چکی تھی۔ اسے سایوں کی اقلیم کی سمت لے جایا جا رہا تھا۔ قہر گمنامی میں دھکیلا جا رہا تھا۔

تانو کو نامعلوم کے خوف نے آ لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کسی ایسی طاقت کے خوف نے جو جیتی جاگتی شے کو یوں اٹھا کر لے جا سکتی ہے جیسے وہ مردہ ہو اور جو انسانی زندگی کو ایک بے معنی سایہ بنا سکتی ہے۔ تانو کی طرح دوسری عورتیں بھی جلد ہی رونے لگیں۔ وہ بھی اس نامعلوم کے خوف میں مبتلا ہوگئی تھیں جس کے اثر میں آ کر آدمی خود زندگی سے ڈرنے لگتا ہے۔ خلیق کا کتا جو حرکت کرتی پالکی کو دیکھ کر بھونکنے لگتا تھا آج خاموش کھڑا تھا۔

دانتوں میں خلال کرتا ہوا مجید اپنے صحن کے بڑے سے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اس نے پالکی کو دور سڑک پر موڑ کاٹتے دیکھا۔ تھوڑی دیر اس نے ایک دانت کے خلا میں جلدی جلدی خلال کیا اور زمین پر تھوکتا بھی رہا۔ ''میرے دانت میں درد ہے'' وہ چڑچڑے پن سے بڑبڑایا۔ تاہم اس کی مراد دانت سے نہیں تھی۔ اس کے دانت تو اچھے بھلے تھے لیکن اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا کیونکہ جاتی ہوئی پالکی دیکھ کر اسے نہ تو فخر کا احساس ہوا تھا نہ خوشی کا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا سوچے، کیا کہے؟

اس نے گھر کی طرف رخ کیا۔ اسے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ خالی خالی نگاہوں سے اس نے اوپر بلندی پر آہستہ آہستہ چکر کھاتی ہوئی چیل کو دیکھا۔ آسمان اس کے ذہن میں ہمیشہ خدا کا تصور ابھارتا تھا۔ اس لئے بے ساختہ طور پر اس نے ''اللہ اکبر'' کہا اور اندر داخل ہوگیا۔

سورج کی روشنی آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ اکیلی چیل آسمان پر آہستہ آہستہ چکر لگاتی رہی لیکن شکار کے لئے وہ بالکل چوکس تھی۔

باب نمبر 14

مسجد کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ ایک صبح مجید مزدوروں کی نگرانی کرنے کے بعد گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اچانک فروری کے مہینے کی تیز ہوا نے اسے آ لیا۔ بہار کی آمد کا یہ پہلا شگون، وحشیانہ اور جارحانہ شگون ہمیشہ غیر متوقع طور پر اس وقت ظاہر ہوتا تھا جب لوگ یہ یقین کرنے لگتے تھے کہ سرما کے خوش گوار دن، نیلا صاف آسمان، سنہری دھوپ اور صبح کی دھند کبھی ختم نہ ہوگی۔ حیران ہو کر مجید کھیتوں کے کنارے رک گیا۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک بگولہ وحشیانہ رقص کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ سوکھے پتوں اور گرد کو وہ ساتھ لے گیا تھا۔ سوکھے پتے اور گرد و غبار دھرتی کی جلد ہیں جو خشک مہینوں میں خشک ہو کر خوبصورت سا سفید سفوف بن جایا کرتے ہیں۔

موسمی تبدیلی کی اولین علامتیں ہمیشہ خود وقت کو فریب دیتی دکھائی دیتی تھیں۔ لگتا تھا کہ سال رواں اور سال گزشتہ، یہ موسم اور گزرا ہوا موسم، یہ لمحہ اور وہ جو ابھی ماضی کے مزار میں دفن ہوا ہے، دونوں بے وقتی کے خلا میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ ایسے میں ذہن میں اگر کوئی تکلیف دہ خیال آ جائے تو وہ سوچنے والے کی پوری زندگی پر پھیل جاتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے کوئی مسرت کا لمحہ آ جائے تو وہ بھی اس قدر ابھر آتا ہے کہ باقی سب کچھ اس کے پس پردہ چھپ جاتا ہے۔

مجید متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جنونی رقص کرنے والے بگولے اور خشک پتوں اور گرد و غبار کو اپنے دامن میں لے کر چیخنے والی ہوا نے ایسی کسی شے کو عریاں کر دیا تھا جو عرصے سے اس کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ اس کے خیالات بیتے ہوئے برسوں کی طرف جانے لگے۔ پریشانی کے عالم میں وہ یونہی کھیتوں کے کنارے کھڑا رہا۔ اس نے ٹھنڈا

سانس لیا اور سوچا کہ یہاں رہتے ہوئے اسے کتنے سال بیت گئے ہیں؟ گیارہ سال؟ شاید بارہ سال؟ وہ دن اس نے یاد کیا جب وہ پہلی بار یہاں آیا تھا وہ جولائی کا مہینہ تھا اور جمعہ کا دن تھا۔

قدم اٹھاتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔ ہاں وقت گزرتا چلا جاتا ہے کتنی عجیب بات ہے کہ یہ بگولا مجھے اس حقیقت کو یاد دلاتا ہے اور کئی چیزیں بے شمار غیر اہم چیزیں ایک بار پھر ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ ہاں وقت گزرتا چلا جاتا ہے اور چیزیں تبدیل ہو جاتی ہیں کوئی شے بھی ویسی کی ویسی نہیں رہتی لیکن انسان اسے بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فروری کی پاگل ہوا کی اچانک آمد پھر سے اسے یاد دلاتی ہے۔ فطرت تبدیل ہوتی ہے اور ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہمیں بھی لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔ بچپن سے لڑکپن کی طرف اور پھر زندگی سے موت کی طرف۔

ایک ناقابل بیان اداسی اس پر چھا گئی۔ اب وہ جلدی جلدی چلنے لگا اور اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آگے کی طرف درخت، کمہاروں کی جھونپڑیاں بائیں طرف، دائیں جانب کچھ فاصلے پر سبز لنگی باندھے ایک شخص، اوپر آسمان جو اب خاکستری ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ چاہا کہ گرد و پیش کی مادی اشیا پر اپنے خیالات مرکوز کرے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس کا ذہن ماضی کی یادوں کو کریدے جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر خود سے کہا، ہاں یقیناً ہم سب کو بھی لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی بدلنا چاہیے۔ اس جمعہ کے مارے دن جب میں پہلے یہاں آیا تھا تو کس قدر بھوکا تھا! تب میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی زمین نہ تھی کوئی گھر نہ تھا، کوئی بیوی نہ تھی اور کوئی مویشی نہ تھا اور اب میں مزار کا پاسبان ہوں۔ میں دولت کماتا ہوں، آسائش سے رہتا ہوں۔ لوگ میرا احترام کرتے ہیں۔ ہاں میں بھی بدلا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ تبدیلی کا رخ بہتری کی طرف ہے۔ پریشان ہونے کی مجھے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

لیکن وہ اس غمگینی سے نجات نہ پا سکا جو کھیت سے اچانک اٹھنے والے بگولے نے پیدا کر دی تھی۔ ماضی اور مستقبل کے بارے میں وہ جتنا سوچتا رہا اسی قدر اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔

دن بھر وہ عجب سے احساس میں مبتلا رہا۔ جب وہ دوسروں سے باتیں کرتا تو

اس کے الفاظ مبہم اور بے معنی ہوتے، جیسے اس کا ذہن کہیں اور کھویا ہو۔ سارا دن ہوا اس غضب ناک شے کی طرح چلتی رہی ہو جسے طویل پابندی کے بعد آزادی حاصل ہوئی ہو۔ البتہ شام کے وقت وہ ایسے ہی اچانک رک گئی جیسے کہ یکلخت وہ شروع ہوئی تھی۔

مجید نے مغرب کی نماز ادا کی۔ لیکن جو خاموشی اب فضا پر طاری ہوگئی تھی، اس میں مجید کی آواز سخت اور بے آہنگ لگ رہی تھی۔ ایک موقع پر وہ کھانسا اور پھر بے چینی سے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا کہ مزار پر پڑے ہوئے سرخ کپڑے کا ایک کونہ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے۔ یقیناً یہ ہوا کی کارستانی تھی۔ پھر بھی اس منظر سے وہ چونک گیا۔ اس کے اندر کوئی شے سختی سے رک گئی تھی جیسے پانی کے بہاؤ پر آرام سے چلتی ہوئی کوئی کشتی اچانک کسی شے سے ٹکرا کر رک جاتی ہے۔ چراغ کی مدھم روشنی میں قبر کا ننگا کونہ مردے کی آنکھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی ڈھانپنا بھول گیا ہو۔

یہ قبر کس کی ہوسکتی ہے؟ مجید نے خود سے سوال کیا۔ یہ قبر اس کی ساری موجودہ خوش بختی کی بنیاد تھی۔ قبر نے اسے ایسی خوشحالی عطا کی تھی جس کا اس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ اس قبر میں کون ابدی نیند سو رہا ہے۔ اس کے پہلو میں رہتے ہوئے اسے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ اب شاید ہی کبھی وہ اس بارے میں سوچتا تھا۔ لیکن اب ایک بے چین کپڑے نے قبر کے کونے کو ننگا کر کے اسے اذیت ناک آگاہی میں دھکیل دیا تھا۔ کسی ظاہری سبب کے بغیر ہی وہ خوف زدہ ہوگیا۔ خوف اور تنہائی کے عالم میں لگتا تھا کہ وہ اس پاگل ہوا کی آوازیں سن رہا ہے جو سوکھے پتے اور گردوغبار اڑائے لیے جارہی ہے۔

اس شام جب رحیمہ اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی تو وہ بار بار ٹھنڈا سانس لے رہا تھا۔ رحیمہ کو تعجب ہوا کہ آخر اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا ہے؟ لیکن وہ پوچھنے کی جرأت نہ کرسکی۔ پہلے زبان کھولنا اس کا کام نہ تھا۔

اس نے دوبارہ ٹھنڈا سانس بھرا اور اچانک چیخ اٹھا ''میری بیوی، کاش ہمارے بچے ہوتے!''

رحیمہ چونک اٹھی۔ مجید نے پہلے کبھی بچے نہ ہونے کی شکایت نہ کی تھی۔ اب اس کا لہجہ بھی عجب سا تھا۔ کئی لمحوں تک وہ کوئی جواب تلاش نہ کرسکی۔ پھر ساڑھی کا پلو کانوں

کے پیچھے کرتے ہوئے اس نے بالآخر زبان کھولی ''میں تو چاہتی ہوں کہ تم حسونی کو متبنّی بنا لو۔ وہ اس قدر موٹا تازہ اور صحت مند بچہ ہے''۔

پل بھر سوچ کر وہ کہنے لگا ''نہیں کسی اور کے بچے کے ساتھ خوشی نہیں ملا کرتی، بچہ وہ جو اپنا خون ہو''۔

کافی دیر تک دونوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

خاموشی مجید پر گراں گزر رہی تھی۔ وہ ایک ایسی محسوس کر رہا تھا جسے رحیمہ دور کر سکتی تھی نہ گود لیا ہوا بچہ دور کر سکتا تھا، اسے یوں لگا جیسے اسے کسی ایسی شے کی ضرورت ہو جو پہلے سے اس کے پاس موجود نہیں۔

''شاید خدا کی مرضی یہی ہے'' اس نے رقت بھرے لہجہ میں کہا ''لیکن بچے کے بغیر زندگی کس قدر خالی خالی سی اور ویران ہے''۔ قبر کے ننگے کونے کا منظر پھر سے اس کی نگاہوں میں پھرنے لگا تھا۔ مردے کی آنکھ جسے کوئی بند کرنا بھول گیا تھا اور جو اب اسے موت کا احساس دلا رہی تھی۔ زندگی کے بے سود ہونے کا ان ارمانوں اور خوابوں کا جو لکھے گئے۔ ادھورے پن کے ایک اذیت ناک جذبے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

دوسری صبح جب وہ قران کی تلاوت کر رہا تھا تو اس کی روح کے دکھ نے اس کی نرم اور سریلی اواز میں اذیت کا عنصر شامل کر دیا تھا۔ آواز کانپ رہی تھی اور اونچی نیچی ہوتی ہوئی کبھی کبھی محض سرگوشی بن کر رہ جاتی تھی۔ متلاشی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

جب وہ تلاوت ختم کر کے صحن میں آیا تو سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹ اب بھی بے آواز انداز میں تلاوت کر رہے تھے۔ صحن کے دوسرے کنارے پر گائے کے چھپر کی نیچی چھت پر رحیمہ کدو کے بیج پھیلا رہی تھی۔ اس نے رخ ادھر کیا تو آنکھوں کے کونے سے مجید نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ کسی اجنبی عورت کو دیکھ رہا ہو۔ لیکن اس کے ذہن میں کوئی خواہش نہ مچلی۔

رات کو اس نے رحیمہ سے کہا، ''بی بی میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

رحیمہ اس کی ٹانگیں دباتے دباتے رک گئی اور انتظار کرنے لگی۔ اس کا منہ تھوڑا سا ادھر ہو گیا تھا۔

''بی بی ہمارا گھر خوشیوں سے محروم گھر ہے۔ غم اور اداسی کا یہاں ڈیرا ہے۔ ہم

ایک ایسی کشتی کے دو اجنبی مسافر ہیں جو بہے چلی جاتی ہے لیکن کسی منزل پر نہیں پہنچی''۔

رحیمہ خاموش رہی۔ وہ اس کی بات اچھی طرح سمجھ ہی نہ پائی تھی۔

''میں اس طور خوش نہیں ہوں'' اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔''اگر گھر اس طرح اداس اور ویران ہو تو پھر اس ساری زمین، اناج کے ڈھیر اور ان اچھی بھلی فصلوں کا فائدہ ہی کیا ہے؟ میں تمہیں بتاؤں۔ یہ ایک بانجھ گھر ہے۔ ایسا گھر جو مجھے کوئی خوشی کوئی مسرت نہیں دیتا، ہمارا گھر صحرا کی مانند ہے''۔

رحیمہ نے اب بھی کچھ نہ کہا، لیکن ایک عجیب اور طاقت ور خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اس رات مجید نے زبان بند رکھی مگر دوسری صبح اس نے رحیمہ کو بلایا وہ خاموشی سے اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

''بی بی'' اس نے کہا''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تمہارے لیے ایک سہیلی لانے والا ہوں''۔

اس کے منہ کے کونے ذرا سے سکڑ گئے جیسے وہ مسکرانا چاہتا تھا۔ لیکن ایک ہی پل بعد وہ پھر سے سنجیدہ ہو گیا تھا۔''صرف ایک بچے کی موجودگی سے اس بانجھ گھر کی کایا پلٹ جائے گی۔ لہٰذا میں نے دوسری شادی کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ تفریح کے لئے نہیں۔ مزے کے لئے بھی نہیں۔ میں اس لئے شادی کرنا چاہتا ہوں کہ خدا ہمیں بچوں سے نوازے جو ہمارے گھر میں خوشیوں اور مسرتوں کا پیغام لے کر آئیں گے''۔

وہ رکا تو رحیمہ کو لگا جیسے وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہو لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے رحیمہ وہاں سے آ گئی۔ مجید کے فیصلے سے اس کے دل میں نہ کوئی خوف پیدا ہوا تھا، نہ غصہ، نہ اندیشہ۔ گزشتہ شب وہ اپنے شوہر کی آواز کے عجیب سے لہجے سے ڈر گئی تھی اور اس لئے بھی کہ وہ خوش نہ تھا۔ گھر اسے بانجھ اور بے کیف محسوس ہوتا تھا اور اسے کوئی خوشی عطا نہ کرتا تھا۔ اب اس کا خوف ختم ہو چکا تھا۔ اس کے برخلاف اسے یوں لگا کہ جیسے جلد ہی سب کچھ بدل جائے گا اور اس کا مرد خوش ہو جائے گا۔

باب نمبر 15

جون کے گرم مہینے میں جب سفاک سورج زمین کو جھلسا دیتا ہے، جسم پسینے سے شرابور ہو جاتے ہیں اور گرمی دانوں سے دکھنے لگتے ہیں، مجید کی دوسری شادی کسی دھوم دھام کے بغیر خاموشی سے سرانجام پائی۔ نہ کوئی کھانے کی دعوت منعقد ہوئی اور نہ ہی خوشیاں منائی گئیں۔

دوسری بیوی کے طور پر گھر میں آنے والی لڑکی ابھی کمسن تھی۔ شرم و حیا کے بجائے خوف کے سبب اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا اور چہرے کو بھی ڈھانپے رکھا۔ مجید پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ میں خدا سے ڈرنے والی بیوی گھر لے کر آؤں گا۔ لیکن لگتا تھا کہ آنے والی خدا کے علاوہ زمین کی ہر شے سے بھی ڈرتی ہے۔ کوئی پیار یا ہمدردی کے اشارے کے طور بھی اسے چھوتا تو وہ کانپ جاتی۔

اس کا نام جمیلہ تھا۔ تھوڑی دیر رحیمہ قریب سے اسے دیکھتی رہی اور پھر اس کا دل محبت سے بھر آیا۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتی کہ جمیلہ اچھی طرح کھائے پیئے۔ وہ اس سے محبت اور ملائمت سے باتیں کرتی تاکہ اس کا حوصلہ بڑھے۔ رحیمہ کی کوشش یہ تھی کہ اس نئے گھر میں اسے کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ مجید بھی چوری چھپے اسے دیکھتا، لیکن زبان بند رکھتا۔ وہ نئے کپڑے زیب تن کئے گھر میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ یہ کپڑے اس نے خاص طور پر شادی کے لئے سلوائے تھے اور گلاب کا عطر ان پر مَلا گیا تھا۔

ایک بار کسی شے کی تلاش کے بہانے وہ اس جگہ سے چند قدموں کے فاصلے پر رک گیا جہاں جمیلہ اور رحیمہ بیٹھی تھیں اور دل لگی کے انداز میں کہنے لگا ''اچھا تو کیا اسے

نماز پڑھنا آتی ہے؟''

جواب دینے سے پہلے رحیمہ نے لڑکی سے سرگوشی کی اور کہنے لگی ''ہاں آتی ہے''

''اچھا تو پھر اس نے نماز پڑھی کیوں نہیں''؟

اس بار رحیمہ نے لڑکی سے پوچھے بنا خود ہی اس کی طرف سے جواب دے دیا

''ابھی تو وہ نئی نویلی دلہن ہے، ایک دو دنوں میں وہ ضرور نماز پڑھے گی''۔

چند روز بعد جب اسے ایک پل کے لئے رحیمہ سے اکیلے ملنے کا اتفاق ہوا تو اس سے پوچھ لیا، ''کیا وہ تمہاری عزت کرتی ہے؟''

''ہاں کرتی ہے، وہ اتنی چھوٹی اور اتنی اچھی لڑکی ہے، وہ تو بات کرتے ہوئے میری طرف دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کرتی۔ وہ شاید ہی کبھی کچھ بولتی ہے۔ بہت ہی خاموش ہے''۔

مگر رحیمہ نے غلط سمجھا تھا۔ چند دنوں ہی میں جمیلہ بدل گئی اور بالکل مختلف لڑکی بن گئی۔ پہلے تو اس نے ساڑھی کے پلو سے منہ چھپانا بند کر دیا اور پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹوں سے آشنا ہونے لگے۔ شروع شروع میں وہ مسکراتے ہوئے ساڑھی کو منہ کے آگے کر لیتی تھی جلد ہی یہ تکلف بھی اس نے چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اندازہ کر سکتا کہ اس کی آواز کیسی ہوگی، اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔ جلد ہی یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ باتیں کرنے کی بڑی دلدادہ ہے اور یہ کہ اس کے پاس باتوں کا مواد بھی بہت سا ہے۔ وہ زندگی کے ہر چھوٹے موٹے واقعہ کا اور ان لوگوں کا ذکر کرتی جن کو اس نے کبھی دیکھا تھا یا جن سے کبھی وہ ملی تھی۔

ایک روز مجید گاؤں کے ایک شخص کے ساتھ گھر کے باہر ڈیرے میں بیٹھا تھا کہ تند ہوا کے جھونکے کی طرح آنے والی قہقہے کی آواز پر چونک اٹھا، لگتا تھا کہ جیسے چوڑیوں سے بھرا بازو اچانک کھنکنے لگا ہو۔ آواز گھر کے اندر سے آ رہی تھی اس نے جان لیا کہ یہ جمیلہ کی آواز ہے۔ اس نے سوچا کہ زندگی میں کبھی اس نے کسی کو اس طرح ہنستے نہیں سنا۔ رحیمہ تو خیر کبھی ہنستی ہی نہ تھی۔ مزار پر آنے والے لوگ بھی سنجیدہ رہتے تھے۔ ہاں البتہ کبھی کبھی وہ اچانک پھٹ پڑتے اور زور زور سے روتے یا ہولے ہولے سسکیاں بھرتے۔ لیکن کبھی کوئی ہنسا نہ تھا۔ مجید دورِ ماضی میں کھو گیا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب وہ مکتب میں بدمزاج مولوی کے سامنے قاعدہ پڑھا کرتا تھا۔ وہ دن بھی جب اس نے روزی

کمانے کی بے رحم جدوجہد شروع کی تھی۔ اسے کبھی اس قسم کے قہقہے سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ آیا اس نے پہلے کبھی کسی کو ہنستے ہوا سنا بھی ہے یا نہیں؟

بے حد خوش ہو کر مجید خاموشی سے اسے دوبارہ سننے کی آرزو کرنے لگا۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا شخص بھی دوبارہ سننے کی آس پر اس کے گھر کی طرف کان لگائے ہوئے ہے تو پھر اس کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہونے لگا اور تیوریاں چڑھنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد جب جمیلہ نے اپنے شوہر کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو شرم سے اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا اور دوبارہ ساڑھی کا پلو سر پر لے لیا۔

مجید آیا اور چند لمحوں تک کچھ کہے بغیر اس کے سامنے کھڑا رہا۔

''یہ کون اس طرح ہنس رہا تھا؟'' اس نے درشتی سے پوچھا۔

اس گھر میں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ جمیلہ نے مجید کو اس قدر درشت لہجے میں بات کرتے سنا۔ وہ اچانک سہم گئی اور کوئی جواب نہ دیا۔ لمحہ بھر کے انتظار کے بعد مجید نے اونچی آواز میں کہا ''کسی مسلمان عورت کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اسے ہنستے ہوئے سنا جائے۔ اب دوبارہ کوئی میرے گھر میں اس طرح نہ ہنسے''۔

رحیمہ جو پاس بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی۔ پریشانی سے بڑبڑانے لگی ''ننھی بہن سن لیا تم نے؟''

جمیلہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔

چند روز بعد رحیمہ اور جمیلہ ایک چٹائی بُن رہی تھیں جو دستکاری کا خوب صورت سا نمونہ بنتی جا رہی تھی۔ آسمان پر چیلیں چکر لگا رہی تھیں۔ صحن کے ایک کونے میں دو کوے شور مچا رہے تھے۔ مجید ایک قریبی گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ جہاں اسے ایک قریب المرگ شخص کے لئے دعا پڑھنی تھی۔

بغیر کسی سبب کے جمیلہ قہقہے لگانے لگی۔ خوف کے مارے رحیمہ کا رنگ فق ہو گیا۔

''اس طرح زور سے نہ ہنسو'' اس نے کہا ''کوئی سن لے گا''

لیکن جمیلہ یوں ہنستی رہی جیسے اس پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہو اس کی یہ ہنسی چوڑیوں کی جھنکار جیسی نہ تھی بلکہ بے خوف اور ناقابل مزاحمت تھی جسے سورج کی گرم اور

روشن شعاعیں بادلوں کو چیر رہی ہوں۔

''بند کر'' رحیمہ چلّائی

بڑی کوشش سے جمیلہ نے بالآخر اپنے آپ پر قابو پالیا۔ رحیمہ کو سکون کا احساس ہوا۔ لیکن اس نے سر جھٹکا اور جمیلہ کو متنبہ کیا۔ ''تمہیں یاد نہیں انہوں نے کیا کہا تھا؟ تمہیں اس طرح نہیں ہنسنا چاہیے۔''

''لیکن مجھے ایک ہنسی کی بات یاد آ گئی تھی اور میں ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ تم اسے سننا پسند کرو گی؟''

رحیمہ کو ڈر تھا کہ وہ پھر سے نہ ہنسنے لگے۔ اس لئے وہ محتاط تھی۔

''آخر ایسی ہنسی کی بات کیا ہو سکتی ہے؟'' اس نے کہا

جمیلہ کو خود پر اعتماد نہ تھا۔ ''اچھا تو کیا میں بتا دوں''؟ اس نے بلند آواز میں خود سے ہی سوال کیا۔ اوپر کی طرف اس نے یوں دیکھا جیسے وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہو لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت بھری تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹے اور سر جھٹک کر کہنے لگی ''اچھا تو میں بتاتی ہوں تمہیں پتہ ہے جب وہ مجھے بیاہنے آئے تو دیوار کی دراڑ سے بہن خدیجہ نے اسے مجھے دکھایا۔ میں نے کہا کہ نہیں تم مذاق کر رہی ہو۔ یہ تو ضرور دولہا کا باپ ہوگا اور لگتا تھا کہ اب وہ دوبارہ قہقہوں میں ڈوب جائے گی۔ لیکن تعجب ہے کہ اس نے خود پر قابو پا ہی لیا۔ ''اور جب میں یہاں آئی تو میں نے سوچا کہ تم میری ساس ہو۔''

بات ختم کرتے ہی البتہ قہقہہ پھوٹ پڑا۔ لیکن اس بار اسے خود پر قابو پانے میں زیادہ وقت نہ لگا کیونکہ جونہی اس نے دیکھا کہ رحیمہ کا چہرہ سرد اور اداس ہو گیا ہے اس نے خود کو روکا اور خاموش ہو گئی۔

خاموشی سے دونوں کام کرتی رہیں۔ رحیمہ کی سرد مہری باقی تھی۔ جمیلہ کی آنکھ بھر آئی اور گلا رندھنے لگا۔ جب آنسو آ گئے تو اس نے رحیمہ سے چھپانے کی خاطر رخ بدل لیا۔ لیکن اس کی سسکیوں کی آواز سے رحیمہ چونکی اور اسے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ جمیلہ نے جلدی سے خود پر قابو پا لیا۔ آنکھیں اور ناک پونچھی اور پریشانی دور کرنے کی خاطر سر کو جھٹکا دیا۔

رحیمہ نے نرمی سے پوچھا ''کیوں، تم رو کیوں رہی ہو؟''

جمیلہ کو اب بھی خود پر بھروسہ نہ تھا۔ پہلے تو وہ چپ رہی اور پھر رحیمہ کو دکھانے کی

خاطر وہ جھوٹ موٹ مسکرادی اور بہانہ کیا۔

بس مجھے ذرا گھر کی یاد آ گی۔کبھی کبھی مجھے وہ لوگ اور خاص طور پر اپنا چھوٹا لنگڑا بھائی بہت یاد آتا ہے۔ہاں اور بکری بھی۔میں نے تمہیں اس کا نام بتایا تھا؟ ست رنگی۔ہے نا اچھا نام؟''

اس نے یہ ظاہر نہ کیا کہ رحیمہ کی اچانک سرد مہری نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔رحیمہ نے اسے قریب کھینچ کر ماتھے کو چوم لیا۔آنکھوں میں آنسو آنے کی اب رحیمہ کی باری تھی۔

جلد ہی جمیلہ مجید کے لئے روز افزوں پریشانی کا سبب بننے لگی۔وہ عجیب و غریب لڑکی تھی۔مجید کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اس کا ذہن کیسا ہے۔کبھی لگتا کہ اس پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں اور کبھی وہ صاف آسمان کی مانند فروزاں ہوتی۔اس کے انداز عجیب طور پر ڈانواں ڈول تھے۔بس ایکا ایکی اس کا موڈ بدل جاتا تھا۔لیکن وہ رحیمہ کے سوا کسی کو منہ نہ لگاتی تھی اور مجید سے تو بالکل ہی بات نہ کرتی تھی۔مجید کے پاس یہ جاننے کا کوئی وسیلہ نہ تھا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔

ایک دن صبح سویرے ایک پتلی دبلی سفید بالوں والی بوڑھی عورت مزار پر آ کر واویلا کرنے لگی۔اس کی چبھتی ہوئی چیخ و پکار اور لعن طعن نے صبح کی خاموشی کو منتشر کر دیا۔وہ کہہ رہی تھی کہ وہ خدا کی بے انصافی کے خلاف پکار کرنے آئی ہے۔اس کے سب عزیز و اقارب ایک ایک کر کے مر گئے تھے۔یہاں تک کہ ایک پوتے مانو کے سوا اس دنیا میں اس کا کوئی نہ رہا تھا۔اس کا پیارا انمول ہیرا مانو۔لیکن خدا کو۔تم اسے رحیم و کریم کہتے ہو۔اس نے اس سے یہ ہیرا بھی چھین لیا۔وہ چیختی چلاتی، واویلا کرتی رہی، لرزتی کانپتی وہ بار بار اپنا ماتھا بھی پیٹتی۔

مجید نے اسے دلاسا دینا چاہا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔وہ جب بھی ایک دو لفظ کہتا بوڑھی عورت کا غیض و غضب اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ایک دیوانگی کے عالم میں تیزی کے ساتھ اس نے اپنی میلی کچیلی اور پھٹی پرانی ساڑھی کا ایک کونہ کھولا اور وہ چھوٹے سکّے نکال کر مجید کے قدموں کی طرف پھینک دیے۔

''جو کچھ میرے پاس ہے میں تمہیں دے رہی ہوں''۔وہ چلّائی ''کیا ان سے تمہاری تسکین ہو جائے گی؟''

غصے سے مجید کی آنکھیں سرخ ہوگئیں، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔

''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ خدا جنہیں پیار کرتا ہے انہیں اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ یوں وہ انہیں زندگی کے دکھوں سے بچالیتا ہے''۔

یہ الفاظ کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے الفاظ بے محل تھے اور یہ کہ بوڑھی عورت کا دکھ ساری منطق اور استدلال سے بڑھ چکا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے بوڑھی عورت کے گرائے ہوئے سکے اٹھائے اور کہنے لگا ''ان پیسوں سے میں مزار کے لئے ایک موم بتی خریدوں گا۔ درویش تمہیں سکون عطا کرے''۔

گھر واپس آنے پر اس نے دیکھا کہ اندر والے صحن کے گرد کھڑی بانس کی دیوار میں جو اک موکھا کھلا ہے اس سے لگی جمیلہ کھڑی ہے۔ وہ وہاں اپنے خیالوں میں کھوئی تھی اور کچھ دیر کے بعد ہی اسے مجید کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر دروازے سے قریب بیٹھنے کے لئے آہستہ سے بڑھی۔ دروازے سے ٹیک لگا کر وہ سامنے کی طرف گھورنے لگی اس کا منہ مٹی کی گڑیا کی طرح بے جان تھا۔

رحیمہ لوٹے میں تھوڑا سا پانی لے کر آئی اور اپنے شوہر کی لکڑی کی کھڑاویں اس کے پاس رکھ دیں۔ چھوٹے سے سٹول پر بیٹھ کر مجید نے احتیاط سے اپنا ہاتھ منہ دھویا اور پھر کنکھیوں سے جمیلہ کی طرف دیکھا جو پہلے کی طرح خاموش وہیں بیٹھی تھی اس طرح کہ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مجید دوبارہ باہر آ کر سٹول پر بیٹھ گیا۔ رحیمہ نے اسے حقہ لا کر دے دیا۔

زور سے کھانس کر اس نے کہا ''کیا کوئی بتائے اسے ہوا کیا ہے''۔

رحیمہ نے جلدی سے جمیلہ کو ایک نظر دیکھا ساڑھی کے کونے سے منہ صاف کیا اور کہنے لگی ''میرا خیال ہے کہ وہ اداس ہوگئی ہے''۔

مجید نے جلدی جلدی حقے کے کئی کش لیے۔ ابھی وہ اچھی طرح تیار نہ ہوا تھا۔

''اداس'' وہ کہنے لگا ''کس لئے؟''

رحیمہ نے کوئی جواب نہ دیا اور جمیلہ کی طرف رخ کر کے بہت ترش روئی سے بولی ''بہت ہو چکا لڑکی اندر جاؤ یا کوئی کام کرو''۔

حقے کی چلم سے لہرا کر اٹھتے ہوئے ہلکے نیلے دھوئیں کے پیچھے سے مجید نے جمیلہ کا جائزہ لیا۔ وہ اب بھی بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ مجید کی آنکھوں سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ رحیمہ نے کہا تھا کہ وہ اداس ہوگئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس بارے میں اداس ہے؟ اس پر کسی ذمہ داری کا بوجھ نہ تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ اس کے کوئی مسائل کوئی پریشانیاں نہ تھیں۔ اچھا چلو مان لیا کہ وہ اداس ہے، دل گرفتہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ یوں بت بن کر بیٹھ جائے۔ اگر سارے پریشان لوگ اس کی طرح عمل کرنے لگیں تو پھر ساری دنیا ہی جامد و ساکن ہو جائے۔ اداسیاں اور پریشانیاں اپنی جگہ لیکن انسان کو کام کرنا پڑتا ہے، بولنا چالنا پڑتا ہے اور عبادت بھی کرنی پڑتی ہے۔

مجید نے حقہ پرے ہٹا دیا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں گرج کر بولا ''اسے کہو کہ دہلیز سے ہٹ جائے۔ کیا اسے معلوم نہیں ہے کہ دہلیز میں یوں بیٹھنا بدشگونی ہے۔ کیا یہ میرا گھر تباہ کرنا چاہتی ہے؟ کیا یہ چاہتی ہے کہ اس گھر پر کوئی بلا آئے اور یہ برباد ہو جائے؟ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔ کوئی بتائے کہ اسے ہوا کیا ہے''۔

اس کی گرج شکست خوردہ غصیلے جانور جیسی تھی۔ اطاعت شعار رحیمہ کا دل دہل گیا لگتا تھا کہ جمیلہ پر بھی اس کا اثر ہوا ہے کیونکہ وہ ذرا سا کانپی تھی۔ اس نے منہ کا رخ تھوڑا سا بدلا اور خالی خالی نگاہوں سے گائے کے چھرے کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ پھر وہ ہولے سے اٹھی اور ناریل کے درخت کے تنے کی بنی ہوئی چھوٹی سی سیڑھی سے نیچے اتر گئی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے تیکھے کولھے آہستہ آہستہ مگر صاف طور پر حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ جلد ہی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

اس شام گاؤں کی سرحد کے پاس دلدل کے اس پار چنگڑوں کی بستی میں کوئی تقریب تھی۔ شام سے جوش و خروش کے ساتھ ڈھول بجنے لگے تھے۔ جمیلہ اپنے بستر میں بے حس و حرکت لیٹی ڈھول کی آوازیں سن رہی تھی۔ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا مجید بھی جاگ رہا تھا۔ اس کے دل میں آیا کہ جمیلہ سے پوچھے کہ اسے کیا ہوا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا اسے اس بات پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اس عورت نے اس کی طرف سے اپنے دل و دماغ کے دروازے بالکل بند کر لئے تھے۔ اس کے لئے اس کے ذہن تک پہنچنا

اور سمجھنا کم وبیش ناممکن تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنا ایسے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہے جس کی کوئی اتھاہ نہ ہو۔

پھر یونہی اسے خیال آیا کہ شاید وہ اس کی کیفیت کا سبب جانتا ہے۔ یہ کیفیت صبح سویرے اس وقت شروع ہوئی تھی جب بوڑھی عورت نے واویلا شروع کیا تھا۔

مرزا کے حوالے سے مجید دکھی اور مصیبت زدہ عورتوں اور مردوں کو دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ اکثر ایسے لوگوں کو دیکھتا تھا جن کی زندگی میں کوئی امید نہ رہی تھی اور جنہیں رنج والم نے برباد کر دیا تھا۔ ایسے معاملات اس نے اتنی کثرت سے دیکھے تھے کہ اب انسانی المیے کا کوئی منظر شاید ہی اسے متاثر کرتا تھا۔ وہ جان گیا کہ اس بوڑھی عورت ہی نے جمیلہ کو پریشان کیا ہے۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ یہ واقعہ کس طرح اس عجیب وغریب رویے کا سبب بن سکتا ہے۔ جوں جوں وہ اس بارے میں سوچتا توں توں سمجھنے میں اپنی ناکامی پر اس کا پارہ چڑھتا جاتا۔

''وہ تو ایسے کر رہی ہے جیسے اس کا محبوب بچھڑ گیا ہو۔'' غصے سے دانت پیستے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور چنگڑوں کی بستی میں ڈھول کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جلد ہی جمیلہ نیند کی آغوش میں کھو گئی۔ مجید نے یہ عادت بنا لی تھی کہ ہر رات جب وہ سو جاتی تو وہ ہولے سے اسے پیار کرتا۔ وہ اس کے جانے بغیر پیار کرنا پسند کرتا تھا۔ اسے پیار کرتے ہوئے ایک عجب سا ناقابل بیان جذبہ اس پر حاوی ہو جاتا۔ اس عجیب جذبے اور اس ناقابل بیان خواہش کا پہلے اسے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ اس کی شدت بڑھتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مجید کی الجھن بھی کیونکہ وہ اسے سمجھ نہ سکتا تھا۔ لیکن ہر بار یہ خواہش بالآخر اس گرم جسمانی خواہش میں تبدیل ہو جاتی جسے وہ خوب سمجھتا تھا۔ تب اسے قرار آ جاتا تھا۔

البتہ اس رات وہ اکڑا رہا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا منہ بدمزہ ہو رہا تھا۔ اس کی کنپٹیاں دکھ رہی تھیں اور اس کی نسیں ڈھول کی آواز کے آہنگ پر دھڑک رہی تھیں۔

ایک بار پھر وہ غصے سے بھڑک اٹھا اور اندھیرے میں بڑبڑایا ''رنڈی مال زادی۔''

اسے خوف لاحق ہونے لگا۔ خود سے اس نے سوال کیا۔ ''یہ میں بیوی بنا کر کس

شے کو گھر لے آیا ہوں؟ پتلے دبلے جسم اور نازک سے چھوٹے منہ والی یہ لڑکی کس قسم کی ہے۔ اس نے تو پہلی نظر میں مجھے گھائل کر دیا تھا''۔

بالآخر وہ بھی سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو ڈھول کی آواز بند ہو چکی تھی اور رات خاموش تھی۔ جاگنے پر اس نے معمول کے مطابق اللہ اکبر کہا اور پھر انگلیاں چٹخانے لگا اس نے دوسری طرف پہلو بدلا تو دیکھا کہ چارپائی خالی ہے۔ جمیلہ جا چکی تھی چند لمحوں کے لئے وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ جلدی سے اٹھا' چارپائی کے قریب فرش پر تیل کا چراغ روشن کیا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف بڑھا جو دراصل بند برآمدہ تھا۔ وہاں رحیمہ کے کشادہ سینے پر سر رکھے جمیلہ بے سدھ سوئی پڑی تھی۔ جب تیل کے چراغ کی سرخ سی روشنی اس کے منہ پر پڑی تو اس نے تھوڑی جنبش کی۔ لگتا تھا کہ وہ کچھ چوس رہی ہے جیسے کوئی ننھا سا بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے چمٹا ہو۔

دوسری صبح جمیلہ تر و تازہ تھی۔ لیکن مجید کی پریشانی کم نہ ہوئی تھی۔ دن بھر وہ جمیلہ کے عجیب و غریب رویے پر غور کرتا رہا۔ شام کو جب رحیمہ بالٹی میں دونوں ہاتھ ڈال کر گایوں کے لئے چارہ تیار کر رہی تھی مجید آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ رحیمہ کا منہ پسینے سے شرابور تھا اور گرد و پیش مچھر بھنبھنا رہے تھے اس نے پوچھا۔

''جمیلہ کہاں ہے؟''

بسا اوقات سورج غروب ہونے کے فوراً بعد جمیلہ کچھ کھائے پیئے بغیر سو جایا کرتی تھی۔ دوسری صبح بھوک کی شدت سے مغلوب ہو کر وہ رات کے بچے کچے کھانے پر جھپٹ پڑتی تھی۔ مجید کے زور دینے پر اس نے شام کی نماز پڑھنی شروع کر دی تھی لیکن عشاء کی نماز اکثر چھوٹ جایا کرتی تھی۔

ہلکی لیکن غصیلی آواز میں مجید نے کہا''وہ سو رہی ہو گی۔ کیا بکواس ہے کیا وہ سمجھتی ہے کہ وہ بیگمات کی طرح یوں سو سکتی ہے جب کہ تم نوکروں کی طرح کام کر رہی ہو؟''

رحیمہ خاموش رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ وقفے کے بعد مجید نے پھر پوچھا''کیا اس نے نماز پڑھی ہے؟''۔

جمیلہ نے مغرب عشاء دونوں نمازیں واقعی پڑھی تھیں۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ عشاء کے وقت کا انتظار کرتی رہی تھی۔ اسے نیند کے جھونکے آ

رہے تھے پھر بھی وہ نماز کی خاطر جاگتی رہی تھی۔ یہ ایک کڑا امتحان تھا مگر وہ اس میں کامیاب رہی' اس وقت رحیمہ کھانا پکانے میں مصروف تھی اور اسے اس بات کا پتہ نہ چلا تھا۔لہٰذا اب اس نے بزدلی سے کہا۔''مجھے نہیں معلوم۔شاید پڑھی ہوگی''۔

''وہ شاید'' والی بات میری سمجھ سے باہر ہے۔جاؤ اور جگا کر اس سے پوچھو۔ اگر اس نے نماز نہیں پڑھی تو اب پڑھنے کو کہو''۔

رحیمہ نے خاموشی سے چارہ تیار کرنے کا کام ختم کیا اور ایک گائے کے آگے بالٹی رکھ دی جو اس میں اپنی ناک ٹھونس کر مزے لے کر کھانے لگی۔ پھر اس نے ہاتھ منہ صاف کیا اور گایوں کے چھپر سے نکل کر گھر کے اندر چلی گئی۔ مجید اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

رحیمہ آہستہ آہستہ جمیلہ کو ہلانے اور آوازیں دینے لگی۔ چند قدموں کے فاصلے پر مجید کھڑا تھا۔ جمیلہ بے سدھ پڑی تھی۔اس نے جنبش تک نہ کی۔رحیمہ کی آواز بلند ہوگئی اور وہ جمیلہ کو زور زور سے ہلانے لگی۔لیکن اسے جگا نہ سکی۔مجید نے چند لمحے مزید انتظار کیا اور پھر اچانک آگے بڑھ کر اس نے جمیلہ کو بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور بٹھا دیا۔جیسے ہی جمیلہ کی آنکھیں کھلیں ان میں دہشت جاگ اٹھی۔سراسیمگی کے عالم میں وہ چند لمحے بیٹھی رہی اور پھر اپنے خوف کا سبب جانے بغیر چارپائی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔لگتا تھا کہ دہشت کے عالم میں وہ فرار کی راہ تلاش کر رہی ہو۔بالآخر اسے احساس ہوا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔کوئی زلزلہ نہیں آیا اور نہ ہی مسلح ڈاکو گھر میں داخل ہوئے ہیں۔کچھ بھی نہیں ہوا سوائے اس کے کہ مجید سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔اس کے پاس رحیمہ سائے کی طرح خاموش کھڑی تھی۔جمیلہ نے آہستگی سے منہ نیچا کر لیا لیکن اپنی جگہ کھڑی رہی۔مجید نے نماز کے متعلق پوچھا۔وہ خاموش رہی۔پتھر کی طرح جامد اور خاموش وہ وہیں ٹھہری رہی۔

مجید سخت الجھن میں گرفتار تھا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔محبت پور میں اس نے اتنے سال گزارے تھے اور کبھی کسی نے اس قدر ڈھٹائی سے اس کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کی تھی۔لیکن اب یہ چھوٹی سی لڑکی جسے وہ چند روز ہی پہلے اپنے من کے کسی اذیت ناک خلاء کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھر لایا تھا۔اس کے احکامات،اس کی خواہشوں اور اس کی تمناؤں کو خاطر ہی میں نہ لا رہی تھی۔

مجید کا خون غصے سے کھول رہا تھا اور وہ ایک ایسے اندھے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا جسے یہ معلوم نہ ہو کہ کس جگہ کاٹنا ہے۔ اس کے غصے سے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھ کر رحیمہ سہم گئی۔ کئی بار اس نے مجید کو غصے کے عالم میں دیکھا تھا مگر ایسی کیفیت کبھی نہ دیکھی تھی۔ اسے بے رحم اور جنونی غصے کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور وہ سہمی ہوئی آواز میں چلانے لگی

''بہت ہوا جمیلہ بہت ہوا، اب منہ سے کچھ کہو ناں بہن۔ نمازوں کے معاملے میں تمہیں غیر سنجیدہ نہیں ہونا چاہئے۔ ان کی بات کا جواب دو''۔

مجید چیخا، اس کی منتیں کیوں کی جائیں؟ میرے پاس اس کام کے لئے کوئی وقت نہیں۔ اسے یاد رکھنا چاہئے کہ یہ میرا گھر ہے، اس کے باپ کا نہیں ہے۔

جمیلہ یونہی سر جھکائے کھڑی رہی۔

بالآخر مجید کچھ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ تاہم جلدی ہی وہ واپس دروازے کی طرف آ کر چلّانے لگا، ''اسے خدا کا کوئی خوف نہیں یہی اس کا روگ ہے۔ خیر ہم دیکھ لیں گے''۔

دوسرے روز مزار سے واپسی پر مجید نے دیکھا کہ جمیلہ نے بالوں میں خوشبودار تیل لگا رکھا ہے اور انہیں سنوار رہی ہے۔ دروازے کے ساتھ ایک چھوٹا سا دھندلا آئینہ رکھا تھا اور وہ بڑے غور سے اس میں دیکھ رہی تھی۔ جب مجید اس کے قریب پہنچا تو اس نے صرف یہ کیا کہ اسے راستہ دینے کی خاطر کمر سیدھی کر لی اس نے نہ تو مجید کی طرف دیکھا اور نہ ہی تیل ملے سر کو ساڑھی سے ڈھانپا جو دھوپ میں چمک رہا تھا۔

کم و بیش روزانہ ہی اس وقت مجید نیم کے درخت کی شاخ سے بنائی ہوئی مسواک کیا کرتا تھا۔ مسواک کرتے ہوئے وہ صحن میں چکر لگاتا اور اپنی جاگیر کا معائنہ کرتا۔ وہ اپنی سبزیوں کی کیاریوں کو دیکھتا، گائے کے چھپر اور گھر کے پیچھے کے درختوں پر نظر ڈالتا۔ جب وہ اپنی احتیاط سے دیر تک مسواک کر کے فارغ ہو جاتا تو سرسوں کے تیل سے مالش کرتا اور پھر ایک پتلا سا تولیہ لے کر نہانے کی خاطر تالاب کا رخ کرتا۔

اب صرف لنگی پہنے دانتوں میں مسواک دبا کر وہ جلدی سے کمرے سے باہر آیا اور دروازے سے گزرتے ہوئے اس نے جمیلہ پر نگاہ ڈالی۔ وہ اب بھی آئینے میں کھوئی ہوئی تھی اور اپنا عکس دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مجید نے سوچا یہ ہیں وہ

آنکھیں جو نہ خدا سے ڈرتی ہیں اور نہ ہی بندے سے۔

مسواک کرتے ہوئے وہ صحن میں چکر لگاتا رہا۔ اس نے زور سے تھوکا اور سیڑھی کی بنیاد کے پاس پہنچ گیا اور پھر ناریل کے تنے کی سیڑھی پر قدم رکھ کر دوبارہ تھوکا۔ گلا صاف کیا اور کہنے لگا ''حسن کا کیا فائدہ یہ تو عارضی شے ہے۔ اس زمین پر زندگی چراغ کی مانند ہے''۔

جمیلہ نے جلدی سے اس پر نگاہ ڈالی اور پھر آنکھیں دوسری طرف کر لیں۔ یہ اس ہرنی جیسی آنکھیں تھیں جسے شکاری چیتے کی آمد کا احساس ہو گیا ہو۔

''جہاں تک تمہارے ماں باپ کا تعلق ہے'' مجید کہنے لگا ''میں نہیں جانتا کہ ان کے متعلق کیا کہوں۔ یقیناً انہوں نے تمہیں کچھ نہیں سکھایا۔ قیامت کے روز انہیں اس کوتاہی کا جواب دینا پڑے گا''۔

جمیلہ خاموشی سے سنتی رہی۔ مجید نے پھر تھوکا۔

''کل تم سے گناہ ہوا ہے۔ تم نے میری نہیں بلکہ خدا کی بے عزتی کی ہے۔ کیا تم خدا سے ڈرتی نہیں ہو۔ جہنم کی آگ سے تمہیں ڈر نہیں آتا؟''

جمیلہ اب بھی خاموش تھی۔ البتہ اب اس کی آنکھیں آئینے میں اپنے عکس سے لطف نہیں اٹھا رہی تھیں۔

''اور تمہیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ مجید نے دوبارہ کہنا شروع کیا ''تم ایک عام آدمی کے گھر میں نہیں ہو۔ اس گھر پر ایک درویش کی رحمت کا سایہ ہے۔ اس گھر میں رہنے کا مطلب کڑی دھوپ میں پتوں والے درخت کے ٹھنڈے اور محافظ سائے میں رہنا ہے۔ ہم پر ایک ایسے درخت کا سایہ ہے جو مہربان اور رحم دل ہے اور یوں ہم محفوظ ہیں لیکن تمہیں کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے جس سے درویش ناراض ہو جائے''۔

سرسوں کے تیل کی بوتل مجید نے اٹھائی اور پٹھوں کے سوا سارے جسم پر اس کی مالش کی۔ پھر وہ نہانے کے لئے جوہڑ کی طرف چلا گیا۔

چوکس اور پریشان جمیلہ یونہی دہلیز میں بیٹھی رہی۔ مجید کے جانے کے بعد اس کی آنکھوں میں خوف اترنے لگا۔ لیکن یہ خدا کا نہیں، انسان کا خوف تھا۔ بالوں کو سمیٹتے ہوئے آئینہ اور کنگھی کو لے کر وہ گھر کے اندر چلی گئی۔

باب نمبر16

مجید نے اعلان کیا تھا کہ جمعہ کی شب شیرینی کی تقریب منعقد ہوگی۔ مذہبی نوعیت کی تقریر جس میں کھانے کی اشیاء پر نیاز دی جاتی ہے اور نیاز کا کھانا سب مل کر کھاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر شرکت کے خواہش مند افراد جو صاحب حیثیت ہوتے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کھانے کی مختلف اشیاء چاول، گوشت، دال گھی، مسالے اور چینی وغیرہ عطیہ کرتے تھے۔ غریب لوگ بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ دیتے تھے کوئی محض ایک سبز مرچ تو کوئی ادرک کی ایک گانٹھ لے آتا۔ کوئی اپنی طرف سے تھوڑا سا نمک ہی ڈال دیتا۔ گاؤں والے بعض ایسی ضروری چیزیں بھی عاریتاً دے دیتے تھے جو خود مجید فراہم نہ کرسکتا تھا۔ مثلاً بیٹھنے کے لئے چٹائیاں اور چادریں، برتن، اگر بتیاں اور چراغ وغیرہ، گاؤں کی عورتیں کھانے پکانے میں رحیمہ کی مدد کرتیں۔ انہیں اس کا ہاتھ بٹانے میں بہت خوشی ہوتی تھی۔ لکڑیاں جلانے کے لئے صحن میں اینٹوں کی عارضی بھٹیاں بنائی جاتیں اور بڑے بڑے برتنوں میں بہت سا کھانا پکایا جاتا یہ بڑے بڑے برتن ہمیشہ خلیق کے گھر سے آیا کرتے تھے۔ کھانے کو آگ پر رکھنے سے پہلے مجید اس پر نیاز دیتا اور یوں بعد میں سب کھانے والوں کو اس کا ثواب ملتا۔

نیاز کے کھانے کے علاوہ اس تقریب کی اہم بات ذکر کی محفل کا انعقاد تھا اس میں کتنے لوگوں کو حال آجاتا مجید کو تو خاص طور پر حال آتا تھا۔ گاؤں میں اس کی آمد سے پہلے لوگوں نے ذکر کا چرچا تو سنا تھا لیکن کبھی ذکر کی محفل دیکھی نہیں تھی۔ جب اس نے اس کا آغاز کیا تو شروع میں لوگوں کو کسی قدر تامل رہا۔ بلکہ بعض خوف زدہ بھی تھے لیکن اب جب کبھی مجید محفل ذکر کی تجویز پیش کرتا ہے تو سب لوگ جوش وخروش سے تیار ہو جاتے۔

صبح سویرے سے گاؤں کے مختلف گھروں سے چیزیں آنا شروع ہوگی

تھیں۔اور عورتیں مسالے پیسنے لگی تھیں۔کھانے کی چیزوں کا بڑا حصہ، برتن اور دوسری ضروری اشیاء دوپہر کے وقت خلیق کے گھر سے آئیں۔سہ پہر سے پہلے صحن میں تین انگیٹھیاں تیار ہو چکی تھیں اور مزار کے قریب نئی نئی صاف کی ہوئی جگہ پر چٹائیاں بچھائی جا چکی تھیں ان کے پاس مجید کے بیٹھنے کے لئے چھوٹا سا قالین بچھا دیا گیا تھا۔اس پر پھولدار چادر ڈالی گئی تھی اور دونوں طرف تکیے رکھ دیے گئے تھے۔

رات کے وقت مجید نے اپنا لمبا چوغہ پہنا اور جب ذرا اندھیرا ہوا تو وہ مسند پر جا بیٹھا اور چوغے کو اپنے ننگے پاؤں پر لپیٹ لیا۔سبز پگڑی کا سرا اس کی کمر تک لٹک رہا تھا لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں آ رہے تھے۔مجید آنے والوں کو دیکھے جا رہا تھا اور نرم مگر غیر شخصی سے انداز میں ان کے سلام کا جواب دے رہا تھا۔رات خنک تھی۔ہوا رُکی ہوئی تھی اور چراغ آرام سے جل رہے تھے۔مجید کے سامنے چاولوں کے پیالے میں اگر بتیاں جل رہی تھیں۔

عشاء کی نماز کے بعد ذکر کی محفل شروع ہوئی۔لوگوں کا ہمیشہ سے یہ طریقہ تھا کہ شروع میں رکے رکے رہتے۔اس انتظار میں رہتے کہ مناسب فضا پیدا ہو جائے۔بعض سر جھکائے بیٹھے رہتے اور بعض آنکھیں بند کر کے زیر لب دعا کرتے بعض ایسے بھی تھے جو سر اٹھائے ستاروں کو تکتے رہتے۔کبھی کبھی کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔سنجیدہ لہجے میں مجید نے مناجات شروع کی اور پھر ایک پرانی حمد کا کچھ حصہ پڑھا۔اس کی پتلیاں گردش کرنے لگیں۔پھر بھی بیچ بیچ میں وہ حاضرین کے چہروں پر ایک نظر ڈال لیتا۔

پھر ذکر شروع ہوا اللہ ہو.....اللہ ہو.....شانت سمندر کی ایک طویل لہر کی طرح وہ آہستہ آہستہ شروع ہوا اور بتدریج اس میں شدت پیدا ہونے لگی۔ہجوم کی آوازیں ایک آہنگ میں مدوجذر کی طرح اونچی نیچی ہونے لگی تھیں۔اگرچہ لوگوں کو ابھی اپنی آوازوں کا اپنی حرکات وسکنات کا اور ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے کا احساس تھا۔لیکن ایک وحدت میں ڈوب جانے کی سکون آمیز کیفیت زور پکڑنے لگی تھی ان کے ذکر میں ابھی تیزی نہیں آئی تھی۔ایک آہستگی کے ساتھ ذکر جاری تھا۔انہیں کسی قسم کی عجلت نہیں تھی۔نہ کسی قسم کا اندیشہ تھا۔نہ امید وبیم کی کیفیت تھی۔انہیں اپنے مقصد کا اتنا ہی یقین تھا جتنا اس خدا کے وجود کا جس تک وہ رسائی کرنا چاہتے تھے۔ان کے درمیان مزار والے حجرے میں سرخ چادر سے ڈھکی قبر ابدی سچائی کی خاموش علامت بنی ہوئی تھی۔

جوں جوں ذکر تیز تر ہوتا گیا، لوگوں کا حجاب بھی دور ہوتا گیا۔ ایک روحانی کیفیت کے تحت ان میں قرب اور یکجائی کا احساس زور پکڑتا جا رہا تھا رفتار کے تیز ہونے کے ساتھ ہی وقت کا احساس ختم ہوگیا۔ لیکن کسی کو اس کی پروا نہ تھی کہ وہ ماضی حال اور مستقبل سے ماورا دنیا تک پہنچنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ کسی شرابی کی طرح مجید کی آنکھوں میں ایک نشہ کا عالم تھا اس کے جسم پر مستی چھائی ہوئی تھی اور پلکیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ آگے پیچھے جھولتے ہوئے بڑھتے ہوئے آہنگ کے ساتھ اس کی حرکت بھی تیز ہوگئی۔ کبھی کبھی وہ خود کو آگے کی طرف اتنی تیزی سے جھٹکا دیتا کہ اس کا سر گھٹنوں تک جا لگتا۔ پہلے اس کی آواز بلند اور صاف تھی، لیکن پھر جیسے وہ گنبد میں گم ہوتی گئی۔ اب وہ خدا کا پورا نام نہیں پکار رہا تھا۔ بس اس کا ایک حصہ ہی ہونٹوں تک آ رہا تھا۔ باقی حصہ اس کے تیز سانس کی نذر ہو جاتا تھا۔

ذکر کا آہنگ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مجید کے خون کی گردش بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کا سر سینے پر لٹک گیا تھا اور آنکھیں کھل نہیں پا رہی تھی۔ کس بلا کی تیزی کے ساتھ وہ اپنے جسم کو آگے پیچھے حرکت دے رہا تھا۔ جیسے آندھی کے تیز جھکڑ میں ایک ٹہنی کی کیفیت ہوتی ہے بس اسی طرح ذکر کا پہلا سیلاب امڈا ہوا تھا اور وہ اس کے تھپیڑوں میں ایک عجب پراسراری دبی دبی آواز اس کے اندر سے نکل رہی تھی۔ اس کے سینے میں بری طرح دھڑکتے دل کی آواز۔

یہ عمل زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ نقطۂ عروج جلد آ ہی جانا تھا کہ ایک دم سے ایک چکا چوند ہو جائے، ایک بڑا سا شعلہ بھڑک اٹھے کہ ہر خشک و تر کو اپنی لپیٹ میں لے لے، کیا سمندر کیا پہاڑ سب کو خاکستر کر ڈالے۔ ایک ایسا شعلہ جس کی لپک ستاروں تک پہنچے، جس میں ہر شے فنا ہو جائے سوائے عرفان نور کے سوائے اس آگاہی کے کہ ایک تجلی نے ظہور کیا ہے جس کی تابانی میں ذات نے نورِ حق سے وصال حاصل کیا۔

لوگ مجید کی پیروی کر رہے تھے۔ جو وہ کرتا وہی کرتے۔ سو انہوں نے بھی اونچی آواز سے اللہ کے نام کا وِرد بند کر دیا۔ اور جب وہ نور کے سائے سے ماورا ہے چاروں طرف پھیلا ہو تو اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اسم کی قید سے آزاد یہ اسم مبارک ایک اجتماعی آواز میں بار بار بلند ہو رہا تھا، بار بار اس تندی تیزی سے بلند ہو رہا تھا کہ شام کی خاموش اندھیری فضا کو چیرتا چلا جا رہا تھا۔ بنائی جانے والی بھٹیوں میں آگ جل رہی

تھی جس کے شعلے چاند سے محروم رات کے اندھیرے کو کاٹ رہے تھے۔ بڑے بڑے دیگچے آگ پر رکھے تھے۔ مسالوں، گوشت، چاول اور گھی کی بوجھل اور مزیدار خوشبو ہوا میں تیر رہی تھی۔ دوسری عورتیں آگ کے لئے ایندھن تیار کرنے، برتن دھونے اور لکڑی کے بڑے بڑے کفگیروں سے دیگچوں میں پکنے والے کھانے کو ہلانے میں رحیمہ کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

جمیلہ بھی رحیمہ کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ لہٰذا وہ ایک چھوٹے سٹول پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئی اور آگ کو گھورنے لگی۔ بے رحم اور ناقابلِ فہم مناجات کی آوازیں صحن میں پوری قوت کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں۔ جمیلہ نے انہیں سنا تو اسے عجب سا احساس ہوا کیونکہ یہ پراسرار آوازیں اس کے اپنے وجود سے جیسے ٹکراتی محسوس ہوتی تھیں، طوفانی لہروں کی زد میں آئی ہوئی کشتی کی طرح وہ ڈولنے لگی ایک بار تو اسے یوں لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو جیسے وہ دھرتی میں دھنستی جا رہی ہو۔ اس نے سر اوپر اٹھایا۔ اسے لہروں سے اونچا رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے مضطربانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر یہ پل گزر گیا اور اس نے دوبارہ اپنے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

لیکن لہریں اب بھی اٹھ رہی تھیں۔ ان کی رفتار بے رحم انداز میں تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہو گیا۔ پھر اسے محسوس ہوا جیسے اس کا دم گھٹنے لگا ہو تشویش کے عالم میں اس نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ اس کی نظر رحیمہ پر پڑی جو آگ کے پاس کھڑی سنجیدہ اور توانا دکھائی دے رہی تھی۔ خاموشی کے عالم میں جمیلہ اسے دیکھتی رہی لیکن گزرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ ساتھ اسے محسوس ہوتا تھا کہ لہروں کا زور بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ گہری اذیت کی کیفیت میں اس نے ڈوبتے ہوئے شخص جیسی مصیبت زدہ آواز میں پکارا ''بہن!''

رحیمہ ایک بڑے سے برتن کا ڈھکن اٹھا رہی تھی۔ بھاپ کی سرسراہٹ کے سوا اسے کچھ سنائی نہ دیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو آزاد رکھنے کی خاطر اس نے ساڑھی کا پلو سر پر ڈال رکھا تھا اور اس نے دونوں کان بھی ڈھانپ لئے تھے اس کا چہرہ ویسے ہی پُرسکون تھا جیسے کسی شانت دن کو دریا پُرسکون ہوتا ہے، اسے دیکھ کر جمیلہ نے پھر سے حوصلہ پکڑا۔

ذکر جب اپنے عروج پر پہنچا تو ہمیشہ کی طرح مجید بے ہوش ہو گیا۔ جلدی سے لوگ اس کی طرف بھاگے۔ بعض اسے پنکھا جھلنے لگے۔ بعض انبساط کے عالم میں کراہنے

لگے اور بعض اپنے دلوں میں عجب سا جذبہ محسوس کرتے ہوئے اس کے پاؤں چومنے لگے۔ ان کی اس اچانک نقل وحرکت سے چراغ جھلملانے لگے۔

جلد ہی مجید ہوش میں آ گیا۔ جب وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا جوش وخروش بھی ماند پڑ گیا۔ وہ بار بار اپنے دُکھتے ہوئے سینوں سے گہری آہیں بھر رہے تھے مگر ان کے وجد میں کمی آتی جا رہی تھی اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ رہی تھی۔

جہاں دیوار میں شگاف پڑا کہ راستہ بن گیا تھا وہاں درخت کے نیچے ان آدمیوں میں سے ایک کو مدھم سا ہیولا دکھائی دیا۔ لگتا تھا کہ کوئی شخص اندھیرے میں درخت کے نیچے کھڑا ہے۔ یہ ہیولا کسی لڑکی کا دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں تھا۔ اچھا تو کیا یہ محض وہم تھا یا ذکر کا کوئی کرشمہ تھا؟ جلد ہی دوسرے لوگوں نے بھی اس شخص کو دوریوں گھورتے ہوئے دیکھا اور وہ بھی اس درخت کی طرف دیکھنے لگے جس کے نیچے ایک نازک سی لڑکی کھڑی تھی۔ اندھیرے میں وہ پراسرار مگر اس چاند کی طرح دلفریب دکھائی دے رہی تھی جو ہلکے بادلوں میں سے جھانک رہا ہو۔

مجید آنکھیں بند کر کے اپنی انگلیوں سے ماتھے کو دبا رہا تھا اور یوں آرام کر رہا تھا اسے تناؤ بھری خاموشی کا احساس ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور درخت کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ سکتے میں آ گیا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔ مگر آنکھوں میں وہی درشتی کی کیفیت تھی۔ ہولے سے ہنسا اور چاروں طرف بیٹھے ہوئے آدمیوں کو دیکھا۔

''یہ ایک پاگل نوکرانی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کا تعلق میری نئی بیوی کے گھر سے ہے'' پھر درخت کی طرف رخ کرتے ہوئے زور سے تالی بجائی اور پکارا ''بھاگو یہاں سے چلو جاؤ بھاگو یہاں سے لڑکی کا ہیولا وہیں کھڑا رہا۔ ایک خاموشی چھا گئی جس میں کچھ بے کلی کی بھی کیفیت تھی۔ اس عالم میں مجید اور دوسرے لوگ انتظار کرتے رہے کہ وہ لڑکی وہاں سے کسی طور ہٹے مجید کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور چند لمحے پہلے کی مسکراہٹ کا اب کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے سے ایک خشونت پیدا ہوگئی۔ لگتا تھا کہ اس کے غصے کی گرمی درخت تلے کھڑی لڑکی تک جا پہنچی تھی اور اب وہ وارفتگی کے عالم سے نکل رہی تھی آخر وہ چلی گئی۔ مرد اب بھی اس سمت میں گھور رہے تھے

لیکن وہ جا چکی تھی۔

ذکر کا ایک اور دور شروع ہوا لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ اس بار بات نہ بنے گی۔ لوگ ذکر پر اب بھی جھوم رہے تھے، لیکن ان کی نظریں درخت پر لگی ہوئی تھیں اور اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ایک ناقابل بیان مجنونانہ خواہش ان پر غالب آ گئی تھی اور وہ بے چین ہو گئے تھے۔ بھوکے کتے کی طرح وہ ہڈی کی تلاش میں تھے اور ذکر میں اب انہیں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

مجید پر ایک بار پھر مدہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ لیکن صاف لگ رہا تھا کہ یہ مدہوشی بناوٹی ہے۔ جب لوگ چلّانے لگے، اسے پنکھا جھلنے لگے اور دعائیں مانگنے لگے تو بھی یہ سارا نقشہ کچھ مصنوعی سا نظر آ رہا تھا۔

آخر کار وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اداس نگاہوں سے ایک ایک کو دیکھنے لگا پھر اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں جیسے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا ہو۔ لیکن ایک پل بعد اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں، تھوڑا سا کھانسا اور کہنے لگا، ''بھائیو، ذکر ختم ہوا''۔

وہ جو عام طور پر لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑتے تھے آج ویسا نہیں ہوا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ کھانا کھایا۔ انہیں خود پر اعتماد نہ رہا تھا۔ اس لیے کھانے کی آواز ضرورت سے زیادہ ہی آ رہی تھی۔ البتہ کسی نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا اور سب مجید سے آنکھیں چرا رہے تھے۔

باب نمبر 17

عورتیں اور مرد سب اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے لیکن رحیمہ اب بھی آگ کے پاس بیٹھی تھی جو اندر ہی اندر سلگنے والی راکھ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پہلے کی طرح اس بار بھی بوڑھا اولاد اس سے کھانا لے جا کر حاضرین مجلس تک پہنچا نتا رہا تھا۔ لیکن اس رات وہ پہلے کی طرح بار بار کھانا لینے نہیں آیا تھا۔ شاید کھانا ہی اچھا نہ پکا تھا اور مہمانوں کو پسند نہ آیا تھا۔ اس خیال نے سرد ہوتی ہوئی آگ کے پاس بیٹھی رحیمہ کو پریشان کر دیا۔ وہ بد دِلی اور تھکاوٹ محسوس کرنے لگی تھی۔

مجید صحن کی طرف واپس آ رہا تھا۔ وہ اس کے قدموں کے چاپ سنتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے پاس آ کر رک گیا۔ اوپر کی طرف دیکھے بغیر وہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ چپ رہا اور رحیمہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آخر کار مجید کی آواز آئی ''کہاں ہے وہ؟''

اس بات کا اطمینان ہونے پر کہ مجید کھانے کے سبب پریشان نہ تھا، اس نے سر اٹھایا اور اِرد گرد دیکھ کر کسی قدر سادہ لوحی سے پوچھ بیٹھی ''کون؟''

''وہ دوسری'' مجید نے درشت لہجے میں جواب دیا ''وہی بے حیا'' اس کے لہجے میں سختی اور درشتی تھی اور رحیمہ کا دل پھر سے دھڑکنے لگا۔ جمیلہ اسے کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ وہاں صرف کلثوم تھی اور کبڑی عورت چیزوں کو سمیٹنے کی کوشش میں صحن میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔

''سو رہی ہوگی'' اس نے جواب دیا۔

وہ خاموش رہا مگر رحیمہ نے غصے میں اس کے دانت پیسنے کی آواز سن

لی۔ڈرتے ڈرتے اس نے سوال کیا''اچھا تو کیا اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟''

''غلطی؟'' مجید نے طنزیہ حیرت سے دہرایا''نہیں اس نے کوئی غلطی نہیں کی لیکن ایک بار پھر اس نے دانت پیسے۔''کیا تم نے اسے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟''اس نے پوچھا۔

رحیمہ خاموش رہی۔وہ اس سوال کا سبب سمجھنا چاہ رہی تھی۔

''کسے؟''اس نے پوچھا۔

''اسی چھنال کو۔اور کسے؟ کس بے حیائی سے ان کے سامنے کھڑی رہی سب لوگوں نے اسے دیکھا۔بے حیا نے چہرہ بھی نہیں ڈھکا تھا''۔

غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔زور زور سے سانس لیتے ہوئے وہ کانپ رہا تھا۔رحیمہ بت بنی تھی۔اس کی سمجھ میں اپنے شوہر کے الفاظ نہیں آ رہے تھے۔تاہم وہ اس کے خوفناک غصے کو محسوس کر سکتی تھی۔

''اچھا تو وہ باہر نکل گئی اور مردوں نے اسے دیکھا''۔وہ آہستہ سے بولی۔

مجید خاموش رہا جیسے اس سوال کے جواب کی ضرورت ہی نہ ہو۔پھر اچانک وہ وہاں سے چلا گیا اور رحیمہ سانپ سونگھ گیا ہو۔

بعد ازاں گھر کی طرف جاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ مجید دروازے کے پاس ایسے بیٹھا ہے جیسے کوئی بھوت ہو۔وہ مرے مرے انداز میں حقہ گڑگڑ رہا تھا۔ایک بار پھر وہ خوف سے کانپنے لگی اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔اسے لگا کہ اگر اس نے کوئی آواز نکالی تو وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑے گا اور سارا غصہ اسی پر نکال دے گا۔اس کا خوف تیز دھار والے چاقو کی طرح تھا اور اس نے دم سادھا ہوا تھا۔جیسے وہ ذرا ہلے گی بھی تو چاقو اس کے اندر اتر جائے گی۔

لیکن مجید نے اسے دیکھ لیا تھا۔اندھیرے میں سے اس نے آہستہ سے اسے بلایا۔''بی بی مجھے تم سے ایک بات پوچھنی ہے''۔

رحیمہ چند قدم آگے بڑھی اور پھر کھڑی ہو کر حقے کی سرخ آنچ پر اپنی نظریں جما دیں جب بھی وہ خوف زدہ ہوتی تو انی رانیں جکڑ لیتی تھی۔اس طرح اسے قدرے قوت کا احساس ہوتا تھا۔

اس سوال پر رحیمہ نے قدرے اطمینان کا سانس لیا اس کے اعصاب کچھ نرم

ہونے لیکن اب بھی وہ گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا خدا رحم کرے، یہ کیسا سوال ہے، اور اس کا کیا جواب دیا جائے۔

''تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟'' اس نے پوچھا۔

اونچی آواز میں جو رات کی خاموشی میں کچھ زیادہ اونچی لگی۔ رحیمہ کہنے لگی ''میں گستاخی کی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن آپ مجھ سے یہ کیسا سوال کر رہے ہیں؟ میں آپ کو کیسے کبھی بددعا دے سکتی ہوں؟''

مدھم روشنی میں مجید اس کے چہرے کے خطوط مشکل ہی سے دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ اس وقت رحیمہ کی آنکھوں میں گائے کی آنکھوں والی نرمی اور شفقت ہے۔ اس نے سوچا یہ ہے وہ عورت جس پر میں اعتماد کر سکتا ہوں۔ یہ تو گھر کی بنیاد جیسی عورت ہے۔ وہ سکون محسوس کرنے لگا۔

یہ پوچھنے کا سبب یہ ہے کہ'' اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا میں بہت پریشان ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کی شے ہے جسے میں بیاہ کر لے آیا ہوں۔''

اس کی آواز میں محبت اور قربت کا ایک ایسا عنصر شامل تھا جس نے رحیمہ کو حیران کر دیا۔ اس طرح گفتگو کرتے تو اس نے مجید کو کبھی رات کے اندھیرے میں بھی نہ سنا تھا۔ حالانکہ اندھیرے میں وہ ویسا شخص نہ رہتا تھا جو مزار کے کنارے قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ رحیمہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی اور کمرے میں چلی گئی۔ بتی ذرا اونچی کر کے اس نے چراغ جلایا اور بیٹھ کر سوچنے لگی۔ ہاں مجید کا لہجہ آج واقعی مختلف تھا۔ جیسے اس نے اپنے وہ تیر کمان پھینک دئے ہوں جنہیں وہ ہمیشہ تانے رکھتا تھا۔ اب گویا وہ دل کو ہلکا کر رہا تھا۔ دل جو الجھن میں گرفتار تھا، کسی قدر خوف زدہ بھی تھا اور مدد کا طلبگار بھی تھا۔

چراغ کو فرش پر رکھ کر وہ غور سے اسے دیکھنے لگی، اگرچہ اس کے نتھنے سے شعلے کا اسے احساس مشکل ہی سے تھا۔

جب مجید کمرے میں داخل ہوا تو اس نے فوراً ہی دیکھ لیا کہ اس کا حقہ باہر ہی رہ گیا ہے۔ اس پر وہ پوچھنے لگی'' دوبارہ حقہ گرم کروں؟''

''نہیں'' اس نے نرمی سے جواب دیا اور پھر کہنے لگا'' جاؤ تم آرام کرو۔ تم تھک گئی ہوگی''۔

کمرے سے جانے سے پہلے وہ دروازے کے قریب رک گئی۔ پہلے ہچکچائی لیکن

پھر اعتماد کے ساتھ فرش سے نظریں ہٹائے بغیر کہا ''آپ بالکل فکر نہ کری۔ وہ پگلی ہے۔لیکن آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی''۔

ایک اجنبی مسرت کے احساس سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ گلا صاف کرنے کے بعد سنجیدہ لہجہ میں وہ بولی ''خدایا ہم سب پر رحم کر''۔

مجید چپ رہا لیکن اس نے دل ہی دل میں کہا ''آج کی رات مجھے سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنا چاہیے۔''

باب نمبر 18

دوسرے روز جمیلہ کی تعلیم شروع ہوئی۔ جیسے بیج ڈالنے سے پہلے ہل چلانا پڑتا ہے ویسے ہی ذہن کو علم حاصل کرنے کے قابل بنانے سے پہلے ذہن میں بھی ہل چلانا پڑتا ہے۔ یہ بات مجید اکثر اپنے آپ سے کیا کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ ذہن میں پہلے ہل چلانا چاہیے اور اچھی طرح چلانا چاہیے خوف کا ہل۔ جس طرح ہل زمین کو کاٹتا چلا جاتا ہے، اس طرح خوف کا ہل اس طور چلنا چاہئے کہ ذہن کو چیرتا ہوا جائے۔

اس صبح جب جمیلہ شدید بھوک کے عالم میں گزشتہ شب کا ٹھنڈا اور باسی کھانا نگل رہی تھی غیر متوقع طور پر مجید صرف نماز ہی ادا کرنے کے بعد اندر آ گیا۔ عام طور پر وہ صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مزار کے پاس بیٹھ کر قرآن پڑھا کرتا تھا اور اسی وقت واپس آتا تھا جب سورج کافی بلند ہو چکا ہوتا تھا۔

اب جبکہ وہ جمیلہ کے پاس کھڑا تھا اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ متانت سے اس نے کہا ''کل رات تم نے میری توہین کی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ تم نے درویش کو بھی بے حد ناراض کیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ درویش کی برکت شامل حال نہ رہی تو میں ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاؤں گا''۔ ایک پل رکنے کے بعد وہ کہنے لگا ''میں رحم دل انسان ہوں۔ کوئی اور ہوتا تو تمہاری کل کی کرتوت کی وجہ سے گھر سے نکال چکا ہوتا۔ لیکن میں اس قسم کا شخص نہیں ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری کوئی تعلیم نہیں ہوئی۔ تم بس ایک جاہل لڑکی ہو۔ اس لئے میں درویش سے تمہیں معاف کرنے کی دعا کروں گا اور اس بات کی معافی بھی مانگوں گا کہ میں نے تم جیسی لڑکی سے شادی کی ہے اس کے بعد مجھے تمہاری تعلیم شروع کرنی ہوگی۔''

جمیلہ کھانے سے ہاتھ روک کر خاموشی سے یہ باتیں سنتی رہی اس کا سر اب بھی

جھکا ہوا تھا۔

''سن لی ہے تم نے میری بات؟'' مجید نے درشت لہجے میں پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ''تمہاری بھلائی کے لئے ایک بات تمہیں بتا دوں۔ مجھے غصہ نہ دلانا۔ کل رات کی حماقت کے باوجود میں تم سے نرمی سے پیش آ رہا ہوں۔ میں رحم دل ضرور ہوں لیکن برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے سنتی ہو نا؟''

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ غصے پر قابو پاتے ہوئے وہ کہتا رہا ''آج کی رات تمہیں نماز پڑھنی ہوگی۔ لیکن ہے تو لمبی لیکن تمہیں پڑھنی پڑے گی۔ اس کے بعد تم مزار پر جاؤ گی اور درویش سے اپنی کرتوت کی معافی مانگو گی۔ وہ وہاں خاموش لیٹا ہے۔ لیکن ہے وہ زندہ۔ بظاہر مردہ ہے لیکن یہ تو نظروں کا فریب ہے۔ وہ زندہ ہے اور سب کچھ دیکھتا اور سب کچھ جانتا ہے۔''

پھر مجید نے اسے ایک قصہ سنایا کہ ایک رات نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ مزار کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے یاد نہ رہا تھا کہ وضو ٹوٹ چکا ہے اور یہ کہ اب وہ پوری طرح پاک نہیں ہے۔ جونہی اس نے مزار کے اندر قدم رکھا تو اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی جیسے دور کسی جنگل میں شیر دھاڑ رہا ہو۔ وہ حیران رہ گیا۔ جونہی اس نے قدم باہر نکالا وہ آواز بند ہوگئی۔ جب وہ دوبارہ اندر داخل ہوا تو وہ پرجلال اور بارعب آواز پھر آنے لگی۔ شدید پریشانی کے عالم میں وہ ایک بار پھر باہر آیا اور آواز بند ہوگئی۔ تو وہ سوچنے لگا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ جب اس کا اعتماد بحال ہوا تو وہ پھر اندر گیا اس بار گرج کی شدت بے پناہ تھی اور وہ خوف کے مارے کانپنے لگا۔ ڈر کے مارے وہ باہر کی طرف بھاگا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا وضو ٹوٹ چکا ہے اور یہ کہ اس کا جسم پاک نہیں تھا۔ اس پر اس نے حوض کا رخ کیا، دوبارہ وضو کیا اور واپس آ گیا۔ اس مرتبہ مزار ہمیشہ کی طرح خاموش تھا۔ اس رات وہ دیر تک مزار کے کنارے روتا اور دعا مانگتا رہا اس وقت تک جب تک اسے احساس نہیں ہوگیا کہ اسے معاف کر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ساری کہانی جھوٹی تھی اور یہ من گھڑت کہانی اس نے جانتے بوجھتے سنائی تھی اس کے لئے وہ خدا سے معافی کا طلب گار جب اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا تو اسے توقع تھی کہ پہلے کی طرح اب بھی اس کا سر جھکا ہوگا، لیکن یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ خوف کے عالم میں اسے گھور رہی تھی۔ ناراض مزار سے آنے والی عجیب وغریب

آواز کی کہانی نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ مجید نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رکھا، لیکن اندر ہی اندر وہ اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا۔

''اچھا تو تم میری ہدایات سمجھ گئی ہو؟'' خوش ہو کر اس نے پوچھا۔ پہلے تم نماز پڑھو گی۔ پھر مزار پر جاؤ گی اور درویش سے معافی مانگو گی''۔

جواب دیے بغیر جمیلہ نے نگاہیں جھکا لیں۔

اس شام جمیلہ طویل نماز کے عمل سے گزری۔ بار بار وہ اٹھتی بیٹھتی، جھکتی اور سجدے کرتی رہی۔ تاہم یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ محض جسمانی حرکات کر رہی تھی یا واقعی دل لگا کر نماز ادا کر رہی تھی۔

رات بھر کے لئے گایوں کو بند کرنے کے بعد رحیمہ جب اندر آئی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ جمیلہ اب بھی نماز کی چٹائی پر بیٹھی تھی اور ساڑھی کے پلو نے مناسب طور پر اس کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ جب وہ حرکت کرتی تو اس کی چوڑیوں کی ذرا سی آواز سنائی دیتی۔ کمرے کے ایک کونے میں تیل کا چراغ روشن تھا۔ اسے اس عالم میں دیکھ کر رحیمہ کو خوشی ہوئی۔

دوسرے کمرے میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹا ہوا مجید حقہ پی رہا تھا۔ حقہ کی گڑ گڑاہٹ سے رحیمہ اندازہ کر سکتی تھی کہ مجید بھی خوش تھا۔ اس نے نماز ادا کی اور پھر مجید کی ٹانگیں دبانے کے لئے اندر آ گئی۔ دونوں خاموش تھے لیکن کامیابی پر خوش بھی تھے۔ رحیمہ اس کی پتلی دبلی ٹانگوں کو بہت احتیاط اور احترام کے ساتھ دبایا کرتی تھی۔ ان ٹانگوں کا مستقل درد دبانے سے کم ہو جایا کرتا تھا، اور مجید سکون محسوس کرتا تھا۔ دوسرے کمرے سے کبھی کبھی جھنکار سنائی دے رہی تھی اور وہ گہری تسکین محسوس کر رہا تھا۔

بانس کے جھنڈوں، کھیتوں، ندیوں اور دلدلوں پر رات کی سیاسی بڑھتی جا رہی تھی رحیمہ سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور مجید بھی اونگھنے لگا۔ جلد ہی وہ جاگ اٹھا اور توجہ سے آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اب جمیلہ کی چوڑیوں کی جھنکار سنائی نہیں دے رہی تھی۔

جلدی سے وہ دروازے کی طرف بڑھا اور دوسرے کمرے میں جھانکنے لگا۔ جمیلہ اب بھی نماز کی چٹائی پر سجدے کی حالت میں تھی۔ اس نے دل ہی دل میں مانا کہ اس کا سجدہ درست ہے۔ اس کا ماتھا زمین کو چھو رہا تھا جب کہ دونوں ہاتھ سر کے دونوں

طرف سیدھے زمین پر رکھے تھے اور انگلیاں بند تھیں۔ اس کی کہنیاں بھی زمین پر لگی تھیں۔ بعض لوگ کہنیوں کو اس بے ہودگی سے زمین پر رکھتے تھے کہ مجید کو ہمیشہ لگتا کہ انھیں نماز ختم کرنے کی جلدی ہے۔

جمیلہ اس حالت میں پڑی رہی، حالانکہ عام طور پر سجدے میں چند سیکنڈ لگا کرتے ہیں۔ وہ اس انداز میں پڑی رہی۔ کیا وہ سو رہی ہے؟ جلد ہی واضح ہو گیا کہ وہ واقعی سو رہی تھی۔ بظاہر طویل عبادت کے دوران جب وہ سجدے کی حالت میں تھی تو جس طرح ڈاکو اچانک مسافروں کو آن پکڑتے ہیں، اسی طرح نیند نے اس پر غلبہ پا لیا تھا۔

مجید خاموش کھڑا تھا۔ خون پھر سے کھولنے لگا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا دماغ دھک رہا ہے۔ ''یہ لڑکی'' وہ بڑبڑایا ''کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔ یہاں تک کہ خدا کے روبرو نماز پڑھتے ہوئے بھی سو سکتی ہے''۔

جلدی سے وہ اس پر جھکا ایک ہاتھ پکڑا اور تیز جھٹکے سے اسے اوپر کو کھینچ لیا۔ جمیلہ نے خوابیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر وہ اچانک ڈر گئی۔

مجید غرانے لگا۔

''تمہیں کسی سے خوف نہیں آتا؟ جائے نماز پر تم کیسے اس طرح سو سکتی ہو؟ تمہیں خدا کا خوف نہیں؟''

جمیلہ کانپنے لگی، مگر خوف سے نہیں بلکہ غصے سے۔ مجید کی غصیلی آواز سے رحیمہ کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ اس نوجوان لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ جب اس نے جمیلہ کو یوں کانپتے دیکھا تو سمجھی کہ وہ ڈر سے کانپ رہی ہے اس پر وہ خود بھی کانپنے لگی۔ دہشت کے عالم میں اس نے مجید کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

آخر کار مجید کو یقین ہو گیا کہ اس کی ترکیبیں ناکام ہو گئی ہیں ایک بار پھر اس نے جمیلہ کے بازو کو جھٹکا دیا جمیلہ کے قدم ڈگمگا گئے اس نے خود کو سنبھالا۔ مجید کی گرفت کی وجہ سے کلائی پر پڑنے والے نشان کو دیکھا اور کانپتی رہی۔ مجید نے کلائی سے پکڑ کر اسے پیچھے کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ دھکے سے دروازہ کھولا تیزی سے سیڑھیوں سے اترا اور صحن سے گزر کر ڈیرے کی طرف بڑھنے لگا۔

''اسے کہاں لئے جا رہے ہو؟'' پیچھے سے رحیمہ چلائی۔

''مزار کی طرف میں اس وقت تک اسے وہاں تنہاں رکھوں گا۔ جب تک اسے پچھتاوے کا احساس نہ ہو اور خدا کا خوف اس کے دل میں نہ اترے۔

اب جمیلہ ڈر گئی۔ رفتہ رفتہ اس کا خوف اس کے غصے اور نفرت پر غالب آ گیا۔ اس صبح مجید نے اسے بتایا تھا کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس مزار پر جا کر درویش سے معافی مانگنی ہوگی۔ اس خیال ہی سے وہ لرز اٹھی تھی۔ مزار کے قریب جانے سے اسے ہمیشہ ہی ڈر آتا تھا اور مجید کے سنائے ہوئے قصے نے اس کا خوف دوگناہ کر دیا تھا۔ دن بھر وہ خود کو تسلیاں دیتی رہی تھی کہ یقیناً اسے اکیلے مزار پر نہیں جانا پڑے گا۔ اب ایسا تھا کہ مزار اور گھر کے درمیاں تھوڑا سا فاصلہ تھا اور مجید کو پسند نہ تھا کہ اس کی عورتیں وہاں اکیلی جائیں۔

اب یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اسے وہاں اکیلا ہی چھوڑ دیا جائے گا وہ جنونی کیفیت میں پلٹی اور رک گئی۔ مجید کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کے لئے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگی۔ لیکن وہ گرفت کہیں زیادہ مضبوط تھی۔ آخر اس نے یہ کیا کہ اس نے مجید کے چہرے پر تھوک دیا۔

رحیمہ اندھیرے میں گھر کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اسے اس معاملے کی خبر نہ ہو سکی البتہ وہ حیران تھی کہ مجید یکدم یوں بے حس و حرکت کیوں کھڑا ہو گیا ہے جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

تھوک اس کے کرخت چہرے پر پھسل گیا۔ برف کے ٹکڑے کی طرح سرد الفاظ اس کے اندر سرسرانے لگے ''اس لڑکی نے میرے منہ پر تھوکا ہے وہ منہ ہی منہ میں یہ الفاظ دہرانے لگا۔ ابھی اسے اس کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہاں اس نے واقعی اس کے چہرے پر تھوکا تھا--- وہ چہرہ جسے سب احترام کرتے تھے..... وہ چہرہ جس سے گاؤں کا ہر شخص خوف کھاتا تھا..... وہ چہرہ جس کی عزت کی جاتی تھی جب وہ قرآن کی تلاوت کرتا اور امامت کرتا۔

اچانک گویا اسے زبان مل گئی۔ گھر کی طرف رخ کر کے وہ چلایا ''اس نے میرے منہ پر تھوکا ہے''۔

اس اعلان پر رات کی سیاہی بھی کانپتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ رحیمہ اس سے بلند اور کرخت آواز میں چلانے لگی..... ''یہ تم نے کیا کیا او احمق لڑکی!''

بھاگتی ہوئی وہ ان کی طرف بڑھی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس لیے اچانک رک گئی۔ تینوں اب خاموشی کے عالم میں یوں کھڑے تھے جیسے کسی معجزے کا انتظار کر رہے ہوں۔ مجید نے جمیلہ کی کلائی اب بھی گرفت میں لے رکھی تھی۔ اور سیدھا اس کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔ آستین سے اس نے چہرے سے تھوک صاف کیا اب وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔

اچانک اس نے جمیلہ کو بازوں میں دبوچ لیا۔ اس طرح کہ ایک بازو اس کے گھٹنے کے نیچے تھا اور دوسرا اس کی گردن کے نیچے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اسے اپنے بازوؤں اور ٹانگوں سے مارنا نہ شروع کر دے۔ لیکن وہ خاموش رہی اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے جیسے اب اس نے مزید احتجاج نہ کرنا ہو۔ اس کا جسم تنکے کی طرح ہلکا لیکن نرم و گداز تھا۔ شعلے کی مانند مجید میں خواہش بھڑک اٹھی کہ وہ اسے اپنے سینے سے لگا لے لیکن جلد ہی اس خواہش نے دم توڑ دیا۔ اس نے دل میں کہا یہ ایک سانپ ہے، زہریلا سانپ۔ اس کی کشش جال اور اس کا حسن فریب ہے۔ وہ اس قدر خطرناک ہے کہ کوئی عام انسان کبھی اتنا خطرناک نہیں ہوسکتا اور مجھے اس سے اپنی حفاظت کرنی چاہئے۔

وہ مزار میں داخل ہوا جہاں چند چراغ اب بھی ٹمٹما رہے تھے۔ قبر کے پاس اس نے جمیلہ کو گرا دیا۔ ایک بازو کے سہارے خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے قبر کی طرف دیکھا۔ اس کی خوف زدہ نظروں نے آہستہ آہستہ اس کے گرد پھیلی گوٹا ٹنکی لال چادر کو دیکھا جو تودے کی طرح ابھرے ہوئے اس مقام پر پڑی تھی جو ایک انجانی خوف بھری دنیا کے نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔

کمرے میں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ دلدلوں اور کھیتوں پر چھا جانے والے طوفان کے ہیبت ناک شور جیسی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ یہ مجید کی آواز تھی جس نے تلاوت شروع کر دی تھی۔ اس کے گلے سے الفاظ کا ایک سیلاب امنڈ رہا تھا جس کا شور اندھیرے پر، ستاروں پر، آسمان پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ پراسرار اور پر ہیبت الفاظ جو کمرے میں گونجتے ہوئے گردش کرتے یوں باہر نکل رہے تھے جیسے وہ آسمان تک جا پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

طوفان نہیں تھمے گا۔ جمیلہ اب بھی بے ڈھنگے سے انداز میں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی اپنے بازو کا سہارا لے رکھا تھا اور سامنے تکے جا رہی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا

تھا۔ مجید ایک بار اپنی تلاوت کو بیچ میں روک کر دردناک انداز میں کراہنے لگا چونک کر جمیلہ نے اپنے پریشان شوہر کی طرف دیکھا مگر اس نے تلاوت دوبارہ شروع کر دی تھی اور طوفان پھر سے گرجنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں ان دو مرجھائے پتوں کی طرح تھی جو ہوا میں پھڑ پھڑا رہے ہوں۔ بار بار وہ رک کر کراہنے لگتا اور اس کی کراہ رات کی تاریکی کو چیرتی چلی جاتی۔ جمیلہ خوف کے مارے سن ہوگئی تھی۔ بس اس کی پتلیاں گردش کر رہی تھیں۔ باقی اس پر سکتہ طاری تھا۔ ایک مرتبہ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز بانس کے جھنڈ میں ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ جیسی بن کر رہ گئی۔ وحشیانہ نگاہوں کے ساتھ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن مجید بھی جلدی سے کھڑا ہو گیا بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

بالآخر اس نے تلاوت ختم کی اور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا ''میری بات سنو'' اس نے پھر کہا ''تمہارے اندر کوئی بدروح داخل ہوگئی ہے۔ وہ تمہیں اور ہم سب کو نقصان پہنچا سکتی ہے اس وقت تم مزار میں، درویش کے حضور بیٹھی ہو۔ پھر بھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں، خدا کے خوف کی کوئی علامت نہیں ہے، اس کی وجہ وہی بدروح ہے جو تم پر غالب آ چکی ہے۔''

زبان بند کر کے اس نے جمیلہ کو غور سے دیکھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم ڈر رہی ہو'' وہ دوبارہ کہنے لگا ''لیکن یہ تم نہیں بلکہ وہ بد روح یہاں لیٹے ہوئے مقدس بزرگ کی موجودگی کے سبب ڈرنے لگی ہے۔ کوئی نیک اور پاک شخص اس بزرگ کے حضور نہیں ڈرتا''۔

وہ اٹھا اور کہنے لگا ''میں ابھی آتا ہوں''۔

جلد ہی وہ ایک رسہ لے کر آ گیا۔

''میں تمہیں یہاں باندھ دوں گا تاکہ تم بھاگ نہ سکو۔ بدروح تمہیں اکسا رہی ہے جانے تم کیا کچھ کر ڈالو'' وہ اس کی کمر میں رسا لپیٹ کر باندھنے لگا، مجھے یہ کرتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ تم میری بیوی ہو، لہٰذا یہ میرا فرض ہے''۔

جمیلہ کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اس نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ مجید نے اس کے دونوں ہاتھ بھی باندھ دئے مگر وہ خاموش ہی رہی۔ ''دنیا خالہ جی کا گھر نہیں ہے''۔ اس نے کہا ''یہ خدا کی تخلیق ہے اور یہاں سب کچھ اس کی مرضی کے

مطابق ہونا چاہئے۔ بدی کا مقابلہ ضروری ہے جو کچھ برا ہے اور جو کچھ خدا کی منشا کے خلاف ہے، اس پر غالب آنا ضروری ہے۔ صبح تک تم یہی رہو گی''۔ ٹین کی چھت کو سہارا دینے والے لکڑی کے ستونوں میں سے ایک ستون کے گرد رسہ کا دوسرا سرا باندھتے ہوئے اس نے کہا ''تم دعا نہ بھی مانگو تو بھی اس مقدس بزرگ کا قرب تمہیں پاک صاف کر دے گا۔ بد روح تم سے بھاگ جائے گی کیونکہ وہ اس کی موجودگی میں زیادہ وقت نہیں رہ سکتی۔ پھر بزرگ سے ڈرنے کے بجائے تم بدی سے اور خدا کے غیض وغضب سے ڈرو گی۔ خیر تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہ ہو گی کیونکہ بزرگ تمہیں حوصلہ بخشے گا''۔

اب جبکہ وہ وہاں کھڑا اپنے قدموں کے پاس پڑے ہوئے ناک ہے جسم کو دیکھ رہا تھا تو وہ الجھن میں گرفتار دکھائی دینے لگا۔ اسے زیادہ مزاحمت کی توقع تھی۔ لیکن اس کے منہ پر تھوکنے کے بعد جمیلہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی نہ بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو روئی تک نہ تھی۔

باہر جاتے ہوئے مجید نے کہا۔ ''میں دروازہ بند کئے جا رہا ہوں بہتر یہی ہو گا۔ وہ رکا اور پھر کہنے لگا'' دعا مانگو دعا۔ اس طرح تمہارا بھلا ہو گا۔ اس سے معافی مانگو وہ تمہیں معاف کر دے گا۔ خدا مہربان ہے اور وہ بزرگ خدا کا بندہ ہے۔ یہ بھی مہربان ہے۔''

رحیمہ جنگلے کے پاس کھڑی تھی۔ ہولے سے اس نے پوچھا ''وہ کہاں ہے''؟

''مزار کی کوٹھڑی میں اس میں ایک بد روح سما گئی ہے، وہ وہاں رہے گی تو بد روح بھاگ جائے گی''۔

رحیمہ چند لمحے خاموش رہی۔ دکھ کا احساس اس پر چھا گیا تھا ''اسے وہاں ڈر نہ آئے گا؟'' اس نے پوچھا۔

مجید فوراً بھڑک اٹھا۔

''ڈر؟ مزار سے ڈر'' اس نے کہا۔ ''جاؤ سو جاؤ''۔

باب نمبر 19

رحیمہ گھر کے اندر جا کر بستر پر دراز ہوگئی۔ بے چینی کے عالم میں مجید صحن ہی میں رہا اور پھر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر چھوٹے سے چھجے پر بیٹھ گیا وہ منتظر تھا۔ سانس روک کر وہ دردناک چیخ کا انتظار کر رہا تھا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ رات کے آسمان میں شگاف ڈالنے والی کوئی چیخ بلند نہ ہوئی۔ البتہ دور سے کہیں کبھی کبھی الو کے چیخنے کی آواز آ جاتی تھی یا کسی چیل کا بچہ ایسی آوازیں نکال رہا تھا جیسے کوئی انسانی بچہ رو رہا ہو۔ ایک چمگاڈر گھر کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

وہ انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ ڈھلوانی چھت سے شبنم کے قطرے ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ وہ یوں چوکس اور منتظر تھا جیسے کوئی قریب المرگ شخص کے بستر کے پاس کھڑا ہو کر انتظار کرتا ہے۔ درختوں کے پتے ساکت تھے اور رات خاموش تھی۔ مجید اونگھنے لگا مگر کسی بادل کی گڑگڑاہٹ نے اسے جگا دیا۔ مشرقی افق کی جانب بجلی چمکی اور بادلوں کے پہاڑ اس جگہ دکھائی دئے جہاں صبح کے نور نے رات کے اندھیرے کو چاک کرنا تھا۔ اس نے مزار کی طرف دیکھا۔ بانس کی دیوار کے اوپر سے صرف اس کی چھت ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اچھا تو کیا وہ سو تو نہیں گئی یا شاید جاگ رہی ہو؟ اگر وہ سوئی نہیں تو پھر اس نے بادل کی گرج ضرور سنی ہوگی۔ کیا اسے مزار سے آنے والی گرجدار آواز والا قصہ یاد ہے؟ اس وقت وہ کیا سوچ رہی ہوگی؟

مجید انتظار کرتا رہا، البتہ اب اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کس بات کا انتظار کر رہا ہے۔ پریشانی کے عالم میں رحیمہ دروازے تک آئی، لیکن اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ مجید نے اس کی طرف دیکھا اور نہ ہی زبان کھولی۔ وہ دور کے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بار

بار بجلی چمک رہی تھی اور چمک کے بعد ہر بار گرج سنائی دیتی تھی مگر اب وہ خیالوں میں گم نہ تھا اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں اور وہ اندھیرے میں گھور رہا تھا۔ اندھیرا جو صبح سے پہلے ہمیشہ بڑھ جاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ صدیوں تک یونہی انتظار کر سکتا ہے ایک لفظ کہے بغیر۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ رحیمہ کب اپنے کمرے کی طرف واپس چلی گئی تھی۔

بادل نزدیک تر آ گئے اور گرج بڑھ گئی۔ اب جب بجلی کوندتی تو سارا آسمان چندھیا دینے والی روشنی سے منور ہو جاتا اور وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے خود کو برہنہ محسوس کرنے لگتا۔ بجلی کی چمک کے بعد جب روشنی کی طرح اندھا کر دینے والا اندھیرا ہو جاتا تو ہو پوری طرح آنکھیں کھول کر آگے کی طرف جھانکتا۔ ایسے میں وہ اپنے تئیں بوڑھے الو کی مانند محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے آنکھیں جھپکاتا اور بجلی کی ایک اور چمک کا انتظار کرتا۔ لگتا تھا کہ وہ تخلیق، خدا کی پراسرار تخلیق کا مشاہدہ کر رہا ہے اور یہ مشاہدہ بھی عبادت ہی ہے۔ پھر بھی اس کے ماتھے پر تشویش کے آثار نمایاں ہی رہے۔

تیز سرد ہوا چلنے لگی اور بارش کے بوجھل قطرے گرنے لگے۔ مجید کے منہ پر پڑنے والا بارش کا پہلا قطرہ اس کو تھوک کی طرح لگا جو جمیلہ نے اس پر پھینکی تھی۔ پھر اور قطرے اس پر گرے اور انہوں نے شرم کے احساس کو دھو ڈالا۔ اندر جا کر وہ اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا اور خود سے کہنے لگا میں انتظار کروں گا۔ اس بارش کا کیا ہے، وہ جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ رات ختم ہوائے گی اور صبح کی روشنی اس کے اندھیرے کو نگل جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی بدروح بھی ختم ہو جائے گی۔ پھر ہم پر خدا کا نور برسے گا، پاکیزہ اور صاف۔

تقریباً بند منہ اور بھینچے ہوئے دانتوں کے ساتھ اس نے سورہ الفلق کی پہلی تین آیتیں پڑھیں۔ میں نور سحر کے خالق کی پناہ مانگتا ہوں اس کی بدی سے جسے اس نے پیدا کیا، بدی سے ظلمت کی جب وہ شدید ہوتی ہے۔

وہ رک گیا اور چند لمحوں بعد پھر شروع ہو گیا۔ ہاں میں پناہ مانگتا ہوں۔ تمام بدیوں سے۔ اس بدی سے جو دلفریب ہے اور اس سے بھی جو مکروہ اور خوفناک ہے۔

دروازے کے بعد مجید نے دیکھا۔ اندھیرا ابھی تک بہت تھا دوسرے کمرے سے رحیمہ برآمد ہوئی اور ہچکچاتے ہوئے پوچھنے لگی ''ابھی صبح نہیں ہوئی؟''

رات اس کے لئے بے حد طویل تھی۔

اسے نظر انداز کرتے ہوئے مجید اپنے غور و فکر میں گم رہا۔ آہ بھرتے ہوئے اس

نے خود سے کہا: آدمی کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ کچھ کر رہا ہو۔ ہر فعل کے حقیقی معنی تو کہیں اور ہوا کرتے ہیں انسان کو اپنے کسی عمل کے بارے میں خوش یا ناخوش نہ ہونا چاہئے کہ اسے تو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس کا تناؤ قدرے کم ہونے لگا۔ اب رحیمہ کے پاس جا کر اس نے اعلان کے لہجے میں کہا۔

''جلد ہی صبح ہونے والی ہے''۔

نور کے تڑکے سے ذرا پہلے ٹین کی چھت سے غیر معمولی آوازیں آنے لگیں، جیسے اس پر پتھر برس رہے ہوں۔ مجید اور رحیمہ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''ژالہ باری ہو رہی ہے! وہ زور سے بولا رحیمہ نے کچھ بھی نہ کہا۔ صحن کی طرف رخ کر کے وہ احمقوں کی طرح دروازے سے باہر دیکھنے لگی۔

اولے پڑتے رہے اور مجید خاموش رہا۔ ٹین کی چھت، مویشیوں کے چھپر اور صحن میں ہر طرف اولے دکھائی دے رہے تھے۔ ہاں اس کے کھیت بھی ژالہ باری کی زد میں تھے جہاں نرم نرم اور سبز فصل ابھی پھوٹنے لگی تھی۔ وہ دعا مانگنے لگا اور دعا مانگتے مانگتے وہ بار بار دروازے کی طرف جاتا، باہر جھانکتا اور پھر لوٹ آتا۔ اس کے خشک اور بے چین ہونٹوں سے ناقابل فہم دعائیہ الفاظ تیزی سے نکل رہے تھے۔

رحیمہ کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا جواب لکڑی کے چھوٹے سے سٹول پر بیٹھ گئی تھی۔ ''یوں بت بن کر نہ بیٹھو۔ دعا مانگو..... دعا''

رحیمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر کوئی دعائیہ الفاظ نہ آئے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈر جانے والی یہ عورت ژالہ باری کے طوفان سے بے نیاز دکھائی دیتی تھی جیسے اسے اس سے پہنچنے والے نقصان کی پرواہی نہ ہو۔ دوسری بار جب مجید اپنی بیوی کے سامنے آیا تو اس نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہے یہ؟''

رحیمہ نے خود کو جھٹکا دیا اور حیران کن سخت لہجے میں کہنے لگی ''جاؤ اور اس لڑکی کو گھر واپس لے کر آؤ''۔

مجید کچھ کہنے کو تھا لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر وہ آہستہ آہستہ دعا مانگنے لگا۔ اس کی آواز بمشکل ہی سنائی دی رہی تھی۔ جونہی ژالہ باری رکی، وہ باہر چلا گیا۔ گہرے بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے لیکن ان میں سے دن کی روشنی کی اولین

شعائیں جھانکنے لگی تھیں۔ بوندا باندی جاری تھی۔

جب مجید نے مزار والے کمرے کا دروازہ کھولا تو اس نے جمیلہ کو فرش پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی ساڑھی میلی سی لگ رہی تھی اور اس کا سینہ کھلا تھا۔ وہ چت لیٹی تھی اور اس کی چھاتیاں کسی لڑکے کے سینے کی طرح سپاٹ تھیں۔ اس کا ایک مہندی والا پاؤں قبر کو چھو رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مجید اسے بے حرمتی کی انتہا سمجھتا مگر اس وقت اس نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ نیچے جھک کر اس نے آہستہ سے رسی کھولی۔ اس کو بازوؤں میں اٹھایا اور گھر لے آیا۔

جب اسے بستر پر لٹایا گیا تو رحیمہ نے چند لمحوں تک اسے دیکھنے کے بعد پوچھا ''اچھا تو یہ مر چکی ہے؟''

مجید نے سوچا کہ یہ کیسا سوال ہے۔ کسی اور وقت یہ سوال پوچھا جاتا تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتا۔ اب اس نے صرف یہ جواب دیا کہ ''نہیں''۔

پھر اسے خیال آیا کہ اسے یہ کہنا چاہئے تھا کہ جمیلہ ابھی تک بے خودی کے عالم میں ہے۔ بدروح سے نجات پانے والے عموماً تھوڑی دیر اس کیفیت میں رہتے ہیں۔ تاہم وہ خاموش ہی رہا۔

رحیمہ نے گہری تشویش سے جمیلہ کو بے حس و حرکت پڑے دیکھا ہولے ہولے آگے بڑھ کر وہ اس لڑکی کے جسم کو تھپکنے لگی۔ اس کے اندر جذبوں کا سمندر موجزن ہو گیا تھا۔ جمیلہ کا جسم سرد اور نیلا پڑ گیا تھا۔

گاؤدی بنا مجید وہیں کھڑا تھا۔ بے ہوش لڑکی اور پھر رحیمہ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد ایک پل کے لئے اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر کچھ رونما ہونے والا ہے۔ کوئی کرشمہ جو ہر شے کو توڑ پھوڑ کر منتشر کر دے گا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ اس کا سر عجب طور سے ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑا سا کھانسنے کے بعد لہجہ میں افسردگی سی پیدا کر کے اس نے کہا۔ ''میری بی بی، یہ دنیا کڑی امتحان گاہ ہے۔ یہاں ہم سب امتحان سے گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی بے رحمی اور اذیت کے ساتھ ہمیں اس سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہم سب محبت اور اپنائیت کا جذبہ محسوس کرتے ہیں لیکن اس جذبے کو ہمارے فرض کی راہ میں حائل نہ ہونا چاہیے۔ سمجھ گئی ہو نا؟''

باب نمبر ۲۰

رات کو آنے والا طوفان جفا شعار حملہ آور کی مانند ہوتا۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ رات کی آوازیں پرندوں اور جانوروں کی پکار جنگل کی چرچراہٹ، پتوں کی سرسراہٹ اور چھجے سے گرتی ہوئی شبنم کی بوندیں یہ گویا رات کی سانسیں ہوتی ہیں۔ یہ اس امر کا تسکین بخش احساس دلاتی ہیں کہ زندگی کا کارواں رواں دواں ہے۔ لیکن دور کہیں دوری چھپے بادل جمع ہوتے رہتے ہیں۔ سنائی دینے کی حد سے پرے افق پر بجلیاں کوندتی رہتی ہیں اور پھر جب رات کے خواب کو برباد کرتے ہوئے اچانک طوفان ٹوٹ پڑتا ہے تو انسان بے خبری میں اس کے قابو آجاتا ہے۔ دن کی بات اور ہے۔ جب انسان طوفان کو دن کی روشنی میں امڈتے دیکھتا ہے تو اس کے مقابلے کی تیاری شروع کر دیتا ہے ویسے ہی جیسے وہ زندگی کے امتحانوں سے گزرنے کی تیاری کرتا ہے۔

ژالہ باری کا معاملہ بھی یہی ہے۔ دن کے وقت اولے پڑیں تو شاید بعض لوگوں کے لئے خوشی کا سامان بھی لاتے ہوں۔ بچھڑے اپنی ماؤں کو پکارتے ہوئے پناہ لینے کے لئے بھاگتے ہیں لیکن ان کی گردنوں میں لٹکنے والی گھنٹیاں جھومنے لگتی ہیں۔ بچے اور جواں سال بیویاں برف کے ٹکڑے اکٹھے کرنے اور کھانے کے لئے خوشی سے چیختی چلاتی باہر کو بھاگتی ہیں۔ جنت سے گرنے والے ان مزیدار ٹھنڈے ٹھنڈے تحفوں کو چکھ کر وہ خوش ہوتی ہیں..... یہ تو وہ پتھر ہیں جو خدا شیطان کو دور بھگانے کے لئے پھینکتا ہے۔ ہاں بالغ لوگ پریشان بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں ژالہ باری کے طوفان سے پہنچنے والے نقصان کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ پھر بھی ایسا طوفان رات کے اندھیرے میں آئے تو ڈراور ہی طرح کا ہوتا ہے اور وہ بدی کی کسی بے رحم قوت کی موجودگی کا فوری اور اذیت ناک احساس دلاتا ہے۔

گاؤں والوں کی جب آنکھ کھلی تو انہیں کئی قسم کی آفتوں کا خیال آنے لگا۔اس کے بعد ہی وہ جان سکے کہ باہر اٹھنے والا بے پناہ شور ان کے ایک کمال کے دشمن ،ژالہ باری کے طوفان نے پیدا کیا ہے۔ چند لمحوں کے لئے تو انہیں یہ جان لینے سے قدرے تسکین پہنچی۔کم از کم انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کیا ہے۔لیکن جب طوفان جاری رہا تو ان کی تشویش بڑھنے لگی۔لیکن اپنی اپنی جھونپڑیوں میں بند، حیرت زدہ اور بے زبان ان کا دھیان اپنے گھروں کی چھتوں سے مویشیوں کے چھپروں کی طرف گیا پھر باغ میں لگے پھلوں اور سبزیوں کے پکے ہوئے کدوؤں پھونس کی چھتوں سے ہوتا ہوا بالآخر اپنے کھیتوں کی طرف گیا جہاں اناج اگ رہا تھا۔لیکن وہ سب کے سب بے بس تھے۔

کچھ دیر تک یونہی ژالہ باری کا طوفان جاری رہا اور پھر نور کے تڑکے کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔

گاؤں والے اپنے بھری فصل والے کھیتوں اور پھلدار درختوں کا حال جاننے کے لئے آہستہ آہستہ اپنی جھونپڑیوں سے نکلنے لگے۔بعض چل رہے تھے اور بعض بھاگ رہے تھے۔لیکن بالآخر مکمل تباہی کا منظر دیکھ کر سب کے سب جیسے ڈھے گئے ہوں۔طوفان نے فصلوں کو ہی نہیں بلکہ بہت سی آشاؤں اور خوابوں کو بھی روند ڈالا تھا۔اپنی فصلوں سے حاصل ہونے والے پیسوں سے رحمت کو اپنے بیٹے کا بیاہ رچانا تھا۔نوجوان کریم نے اپنی نئی نویلی دلہن کے لئے سرخ حاشیے والی عمدہ ساڑھی خریدنے کا منصوبہ بنایا تھا اور امجد نے سوچا تھا کہ وہ اپنے بڑھتے ہوئے قرض کی ادائیگی شروع کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ معین الدین زمین کا ایک اور ٹکڑا خریدنے کی سوچ رہا تھا۔لیکن اکثر کا خواب یہی تھا کہ آنے والے سال کے دوران وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے دانے پانی کا انتظام کر سکیں گے۔

بیتی ہوئی رات کے ڈرامے اور جمیلہ کو بھول کر اس صبح مجید نے جلدی جلدی نماز ادا کی۔ وہ اندر جھانکے بغیر اس کمرے کے پاس سے گزر گیا جہاں وہ آنکھیں بند کئے سائے کی طرح پڑی تھی۔جیسے زندگی سے دور نکل چکی ہو۔

صحن میں رحیمہ سے آمنا سامنا ہونے پر اس نے صرف یہی کہا ''میں گاؤں کی طرف جا رہا ہوں''۔

گھر سے نکلتے ہی اس نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دئے۔ کچھ فاصلے پر

گاؤں کے پاس اسے کھیتوں میں کھڑے لوگ دکھائی دیئے جو رنج والم کی تصویر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ ژالہ باری نے تباہی مچادی ہے۔ چند لمحوں کے لئے وہ رک کر سوچنے لگا کہ آیا وہ گھر کی دوسری طرف اپنے کھیتوں کو دیکھنے جائے یا نہیں۔ پھر اس نے گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر چلنا شروع کر دیا۔

وہ سوچنے لگا کہ اس آفت کا خلیق پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ پھر جبلی طور پر اسے احساس ہوا کہ یہ امیر آدمی شدید پریشانی کی کیفیت میں مبتلا ہوگا۔ اس آفت سے نہ صرف اس کی فصلوں کا نقصان ہوا ہوگا بلکہ اسے اپنے مزارعوں سے آمدنی بھی نہ ہوگی۔ بلاشبہ اس کا نقصان سب سے زیادہ ہوگا۔ جن غریبوں کو اس قسم کے مصائب کی بناء پر فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جو غریب ویسے ہی فاقہ کشی کا شکار رہتے ہیں وہ کسی نہ کسی طور پر زندگی کے عذابوں سے نباہ کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن خلیق زندگی کی مہربانیوں کا عادی تھا لہٰذا اس کا صدمہ زیادہ ہی ہوگا۔

مجید نے سوچا کہ یہ بھی کس قدر عجیب بات ہے کہ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا ان کے متعلق ہم کم افسوس کرتے ہیں لیکن ان کے بارے میں زیادہ پریشان ہوتے ہیں جن کے پاس کھونے کے باوجود بہت سا بچ رہتا ہے۔

خلیق فاقوں تو نہیں مرے گا۔ آئندہ سال نہیں تو دو برسوں میں ہی وہ اپنا نقصان پورا کر لے گا۔ لیکن گاؤں کے غریبوں کا کیا بنے گا؟ پھر بھی مجھے ان کے متعلق کوئی تشویش نہیں۔ ان کے بجائے میں اپنے دوست خلیق کے متعلق ہی سوچے جا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے نقصان کا بھی خیال نہیں۔ میرے کھیتوں میں اگنے والی ہر شے بھی برباد ہو چکی تھی۔ پھر میں کیوں خلیق کے بارے میں سوچے جا رہا ہوں؟

اپنے اندر گہرائیوں میں اسے اس سوال کے جواب کی خبر تھی۔ لیکن وہ فوراً ہی اس کا اقرار کرنے کی خواہش نہ رکھتا تھا۔ اس کی آمدنی کا بڑا وسیلہ اس کی اراضی اور اس کی فصلیں نہ تھیں بلکہ اس کا ایمان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگرچہ قدرتی آفت سے ایمان اس طرح جلد برباد نہیں ہوا کرتا جس طرح مادی دولت ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک بار ایمان برباد ہو جائے تو پھر وہ بحال نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ژالہ باری کے طوفان سے آنے والی بربادی کو دیکھنے کے لئے اس نے پہلے اپنے کھیتوں کا رخ نہیں کیا اور نہ ہی مزار کی طرف گیا بلکہ وہ سیدھا اپنے دوست کی طرف بھاگ رہا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی

کہ خلیق کو اس میں جو اعتقاد ہے، اسے ضعف نہ پہنچے۔ یہی اعتماد سب سے بڑی بات تھی۔ اگر خلیق کو اس پر مکمل اعتقاد ہے تو پھر دوسروں کو بھی اعتقاد رہے گا۔

تسکین کے گہرے احساس کے ساتھ اس نے خود سے کہا کہ میں اسے اعتقاد دے سکتا ہوں۔ اعتقاد جو سرفراز کرنے والا اور برتر ہے۔ کیا ہوا اگر مزارا ایک فریب ایک جھانسا ہے؟ اصل بات تو یہ ہے کہ اس کے وسیلے سے میں کیا حاصل کرتا ہوں۔ میرا مقصد نیک ہے۔ میری وجہ سے ان غریبوں کی مصیبت بھی کم ہو جائے گی جن کو اب فاقہ کشی کا سامنا کرنا ہوگا۔ یا جن کے قرض کا بوجھ پہلے سے بھی بڑھ جائے گا کیونکہ میں خلیق کو ان کی چھوٹے موٹے طریقوں سے مدد کرنے پر آمادہ کرلوں گا۔ اگرچہ ان کے نقصان سے مجھے زیادہ پریشانیاں نہیں، لیکن میرا فرض ہے کہ مصیبت کی اس گھڑی میں ان کے بارے میں بھی سوچوں۔

جونہی اس نے خود سے یہ کہا، اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل شفقت سے بھر آیا ہے اور اس میں ایک ایسی سکون بخش مسرت امڈنے لگی ہے جو مفید اور بامقصد ہونے کے احساس سے جنم لیتی ہے۔ یہ ایسی مسرت تھی جس کا اس گاؤں میں کئی برسوں تک رہنے کے دوران اسے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔

میں یقیناً خوش بخت ہوں کہ میرے پاس دوسروں کو ایمان عطا کرنے کی قوت ہے۔ ایمان جو آفات کا مقابلہ کرنے کی سکت دے سکتا ہے اور مشکل امتحان سے گزرنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ ایمان کی بدولت انسان ناقابل برداشت کو برداشت کرسکتا ہے اس کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔

جب مجید وہاں پہنچا تو خلیق خیالوں میں گم تھا۔ بے اعتنائی سے اس نے آنے والے کا سواگت کیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بالآخر اس نے کمر سیدھی کی اور مجید کی طرف دیکھا۔

''میں پہلے ہی اپنے بعض کھیت دیکھ چکا ہوں۔ ان کا منظر روح کے گھائل کرنے والا ہے''۔ اس نے چہرے کو یوں رگڑا جیسے وہ سن ہوگیا ہو پھر اس نے مجید کو خوش کرنے کی خاطر جھوٹ موٹ کے لہجے میں کہا۔ ''خیر یہ خدا کی مرضی ہے اور ہمیں اسے تسلیم کرنا ہی.....''

مجید نے کچھ بھی نہ کہا۔ شاید وہ اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ خلیق خدا خوفی کی

اس منافقت سے نکل کر دل کی بات کہے گا۔ اس دوران وہ اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا رہا اور اس نے دلاسے کے چند لفظ بھی خلیق سے نہ کہے۔

مجید کی اس خاموشی کا مطلب سمجھتے ہوئے خلیق نے ایک بار پھر اپنے چہرے کو رگڑا اور اعتراف کرنے لگا کہ ''اس نے تو مجھے برباد کر دیا ہے''۔

''ایسا نہ کہو'' مجید نے کہا۔ ''یہ تو ایک آفت تھی اور ہمیں بہرحال اس سے عہد برآں ہونا ہے۔''

خلیق چپ ہو گیا۔ دل ہی دل میں وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ ایک پل کے لئے مجید نے انتظار کیا اور پھر سنجیدگی سے سر ہلانے لگا۔

''یہ مناسب نہیں ہے''۔ اس نے کہا ''کہ ہم خدا کے کسی کام پر پریشان ہو جائیں''۔ خلیق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی ہم سب نے دکھ اور بدقسمتی کا تجربہ کیا ہے۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ نہ تو فصل پوری طرح برباد ہوئی ہے اور نہ ہی ہم دانے دانے کو محتاج ہونے ہیں آخر سب کچھ تو ہم سے نہیں چھین لیا گیا۔ ہے نا؟''

خلیق اپنے پریشان ہاتھوں سے زور زور سے چہرے کو رگڑ رہا تھا لیکن اس نے کہا نہیں۔ ایک لمحے کے بعد مجید نے ہولے سے کہا ''وہ آ رہے ہیں'' خلیق چونکا۔ چند لوگ آہستہ آہستہ اس کے گھر کی طرف آ رہے تھے۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اسے دکھائی بھی نہ دے رہے تھے۔ اچانک وہ غصے سے بھڑک اٹھا۔ جب بھی کوئی مصیبت آتی ہے یہ میری طرف بھاگتے ہیں۔ آخر کیوں؟

ہلکی سی ملامت کے لہجے میں مجید نے سر ہلایا۔

''تم ناراض ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ ناراض ہو''۔

خلیق ٹھنڈا ہو گیا۔ اداس اور غم کے لہجے میں کہنے لگا۔ ''نہیں نہیں۔ اللہ کے ساتھ میں کیسے ناراض ہو سکتا ہوں؟''

گاؤں والے جب صحن میں جمع ہو گئے تو وہ دونوں ان سے ملنے باہر آئے۔ مجید دلاسے کے چند الفاظ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے دیکھا کہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز وہ خود خلیق ہے۔ زمین کا مالک جوان سے بات کرنے کا خواہش مند دکھائی نہ دیتا تھا۔ خلیق کے

چہرے پر کرختگی تھی۔ بالآخر ایک دیہاتی نے کہا ''ہم کیا کریں گے؟ ہماری ساری فصلیں برباد ہوگئی ہیں''۔

تب مجید نے گلا صاف کیا اور کہنے لگا'' بھائیوں ہمت نہ ہارو۔ خدا پر بھروسہ رکھو وہ رحیم وہ کریم ہے۔ اس آفت کے ذریعے تو وہ ہمارا امتحان لے رہا ہے۔''

جواب میں اس نے کراہتے ہوئے خدا کا نام لیا۔ لیکن ان کی نظریں خلیق پر ہی جمی رہیں جواب بھی ان سے بات کرنے پر آمادہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کا چہرہ کرخت تھا اور ماتھے پر بل تھے۔ اس امر کو بھانپتے ہوئے مجید نے ہاتھ اٹھایا اور کہنے لگا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم خلیق کا مشورہ چاہتے ہو وہ بھی تمہاری طرح پریشانی میں ہے۔ اس لئے میری بات سنو اور گھروں کو لوٹ جاؤ۔ ہاں تم سب کے سب۔ جاؤ اب میں خود ان سے بات کروں گا۔ پھر اپنا بنیادی کردار ادا کرتے ہوئے اس نے جلدی سے اعلان کیا۔'' میں تمہارے لئے دعا بھی کروں گا''۔

ہجوم سے دکھ کی ایک اور صدا بلند ہوئی۔ لیکن لوگوں کی نظریں خلیق سے نہ ہٹیں خاموشی کے مناسب وقفے کے بعد۔ جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ مجید کی بات سن لی گئی ہے اور پسند بھی کی گئی ہے ایک بوڑھا آدمی اٹھا اور خلیق سے مخاطب ہوا'' ہم کیا کریں گے؟ ہم تمہارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ اور کہاں جائیں''۔

خلیق نے اوپر کی طرف دیکھا اور کرختگی سے کہنے لگا ''لیکن میری طرف کیوں؟ کیا میں برباد نہیں ہوا؟ کیا وہ میری فصلیں نہ تھیں جن کا تم ذکر کر رہے ہو؟''

''لیکن جناب ہم ڈرے ہوئے ہیں جدھر دیکھتے ہیں۔ ادھر ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔''

اشتعال کے عالم میں خلیق نے اپنی ہتھیلی ماتھے پر دے ماری۔ بددیانت لومڑ اس نے خود سے کہا اچھا تو تمہارے خیال میں مجھے روشنی نظر آ رہی ہے؟ وہ پھٹ پڑا۔ جاؤ میرا پیچھا چھوڑو بھاگو یہاں سے!''

مجید کو خلیق کا یوں پھٹ پڑنا اچھا نہ لگا۔ لیکن وہ سب کے سامنے اسے جھڑکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے بھی لوگوں کو چلے جانے کی تلقین کی۔

''اس وقت انہیں اکیلا چھوڑ دو۔ وہ ضرور مہربانی کریں گے لیکن اس وقت تم سب گھروں کو چلے جاؤ''۔

خلیق کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔

''ان پر مہربانی؟'' وہ چلایا۔ ''کیوں؟ ہمیشہ مجھے دھوکا دینے کے علاوہ انہوں نے میرے لئے کیا کیا ہے؟''

''جاؤ جاؤ اب'' خلیق کے رویے کو دیکھتے ہوئے مجید نے زور سے کہا۔ ''جاؤ اور دعا مانگو۔ مصیبت کے وقت انسان کے بجائے خدا سے رجوع کیا کرو۔ سمجھتے ہو نا؟

پریشان لوگ آہستہ آہستہ جانے لگے۔ جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو مجید کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خلیق کے چہرے پر غصے کا اب کوئی نشان نہ تھا۔ البتہ گہرا رنج والم محسوس کیا جاسکتا تھا۔ مجید پریشان ہوکر خاموش بیٹھ گیا۔

خلیق اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ تباہی اس قدر زیادہ نہ تھی کہ اس کے اس قدر غصے کا جواز بن سکے۔ لیکن اندر ہی اندر وہ پریشان بھی تھا۔ حالیہ برسوں میں کئی نامعلوم خوفوں کا شکار ہوا تھا ایک زمانے میں اس کی خود اعتمادی اس قدر زیادہ تھی۔ وہ اس قسم کے مصائب کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ لیکن اس صبح جب ژالہ باری کے طوفان کے دہشت ناک شور سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ بے حد خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اس نے سمجھا کہ گویا ہر شے ختم ہورہی ہے اور یہ کہ ہر وہ شے جو اسے محبوب تھی اور جو زندگی کو بسر کرنے کے قابل بناتی تھی، وہ اس کے ہاتھوں سے نکل رہی ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے عام حالات میں بھی اسے کبھی پوری طرح تحفظ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں کسی اچانک آفت کا خوف ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اسے یوں لگتا کہ ایک دن جب وہ جاگے گا تو اس کا سارا مال و دولت کسی حسین خواب کی طرح غائب ہو چکا ہوگا۔ زندگی اس کے لئے جفا کار متلون مزاج، غیر معقول اور اندھی بلا جیسی بن گئی تھی جو کسی سبب کے بغیر اسے ادھر ادھر ٹھوکریں لگاتی رہتی ہے۔ اراضی، گھر بار اور خوشحالی کے سبب اسے خوش باش زندگی بسر کرنی چاہیے اور زندگی سے پیار کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے وہ ہر لحہ اندھی تقدیر کی بے رحمی کا شکار ہونے کے خوف میں مبتلا رہتا تھا۔

کراہتے، کانپتے، خلیق نے ٹین کی اپنی وسیع وعریض چھت پر اولے گرنے کی آوازیں سنی تھیں۔ بے حس وحرکت بیٹھے بیٹھے اس کا گلا خشک ہوگیا لیکن وہ کچھ سوچنے کا حوصلہ بھی نہ پاسکا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے غور وفکر شروع کیا تو پھر زندگی کا بے رحم اور

وحشی بھوت اسے بے بس کر دے گا۔

اسے کسی صورت کوئی چین نہ تھا۔ رات کو بھری ہوئی بندوق پہلو میں رکھ کر سونا پڑتا تھا۔ آخر اس شخص کے لئے کیا امن وسکون ہوسکتا ہے جو خود تو امیر ہو جائے لیکن اس کے گرد وپیش باقی سب لوگ، بھوکے اور مفلس رہیں۔ دوسرے تو ہر وقت اسے گرانے اور اسے دکھ کے اپنے تاریک کنویں میں گھسیٹنے کی کوشش کریں گے۔

مجید کی تیز نگاہوں نے خلیق کو پریشان کر دیا۔ جب وہ بولنے لگا تو اس کا ماتھا پسینے سے شرابور ہو چکا تھا ''میں دل کا کمزور ہوں، باتوں سے پریشان ہو جاتا ہوں''۔

''کیسی باتیں''؟ مجید نے نرمی سے پوچھا، لیکن اس کی آواز میں تجسس کا عنصر بھی واضح تھا۔

وہ بہت سی باتیں ہیں ایک تو مجھے ہمیشہ یہ ڈر رہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہوگا اور مجھے لے ڈوبے گا۔ زندگی اس قدر بے اعتبار شے ہے۔ طوفان نے تو مجھے اس کا اور احساس دلا دیا ہے۔

خلیق کی آواز اور آنکھوں میں ایسی کوئی بات تھی جس نے مجید کو اندر ہی اندر کانپنے پر مجبور ہو کر دیا۔ تاہم بظاہر وہ پُرسکون رہا۔

''دل کا وہی کمزور ہوتا ہے جو گناہ کرتا ہے'' اس نے کہا۔ ''گناہ گار تو اپنے سائے سے بھی کانپ جاتا ہے۔ تم گناہ گار نہیں ہو میرے دوست''۔

خلیق نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ مجید کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ اب میری طبیعت بہتر ہے۔ تمہارے لفظوں سے مجھے بہت تسکین ہوئی ہے۔

مجید کو اپنے دوست کے اس اچانک اعلان پر اعتبار نہیں تھا ''مجھے اس کی خوشی ہے'' اس نے محض یہی جواب دیا۔ شاید وہ اس سے زیادہ کہنا پسند کرتا۔ وہ خلیق کو یہ بتانا پسند کرتا کہ اسے اس کی مدد کی ضرورت ہے یہ کہ اگر اس کا ایمان ہی کمزور پڑ گیا تو پھر غریبوں اور جاہلوں کے ایمان کا کیا بنے گا۔ ان کا ایمان تو ویسے ہی کمزور ہوتا ہے تاہم اس نے محسوس کیا کہ دوست کو تلقین کرنے کا یہ کوئی مناسب موقع نہیں ہے۔

''اسی لئے میں تمہارے پاس آیا تھا'' مجید نے دوبارہ دلاسا دینے کے انداز میں کہا۔ ''اب تک ہمیں کسی حقیقی آفت کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ جب یہ آفت آئی تو سب سے پہلے مجھے ہی خیال آیا کہ تمہارے پاس آ کر تمہیں دیکھوں''۔ گفتگو رک گئی۔ مجید نے

اڑتی سی نظروں سے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ اب اسے کہہ ہی دینا چاہیے۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ عوام کی خاطر تمہیں اور مجھے اکٹھے ہونا چاہیے۔ جب اس قسم کی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو لوگوں کا ایمان ڈولنے لگتا ہے۔ خدا کی طرف سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ان کے ایمان کو پکا کریں''۔

خلیق محض چہرے کو رگڑ رہا تھا اور بے دلی سے سر ہلا رہا تھا۔ ایک پل کے لئے مجید نے اسے دیکھا اور پھر یکدم کھڑا ہو گیا۔

''اب مجھے جانا چاہئے''۔

صحن پار کرتے ہوئے مجید نے سوچا کہ اپنے اس دوست سے رخصت ہوتے ہوئے پہلے ہونے پہلے کبھی اس نے اس قدر بے اطمینانی محسوس نہیں کی تھی۔ پھر اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر غصے کا شعلہ بھڑک اٹھا کہ ضرورت کی اس گھڑی میں خلیق اس کے کام نہیں آیا بلکہ اسے تنہا چھوڑ گیا ہے۔ کیا وہ دوست کی حیثیت سے فوراً اس کے پاس نہیں پہنچا تھا؟ تاکہ دونوں ایک دوسرے کو دلاسا دے سکتے تاکہ دونوں زندگی پر دوبارہ اعتماد حاصل کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے۔ ایک دوسرے پر ثابت کر سکتے کہ زندگی اس قدر بے اعتبار نہیں، کیونکہ انسان دوستوں پر ہمیشہ بھروسہ کر سکتا ہے۔ ہر کسی کو خاص طور پر مصیبت کے وقت اس اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے کہ اسے تنہا نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن جو شخص اپنے ہی مبالغہ آمیز خوفوں کے بوجھ تلے یوں بے بس ہو جائے، وہ کسی اور کی کیا مدد کر سکتا ہے؟

''مجھے خبر نہ تھی'' مجید نے ایک تحقیر آمیز انداز میں سوچا ''کہ خلیق اس قدر بزدل اس قدر بے حوصلہ ہے''۔

مجید کی خفگی کا ایک اور سبب بھی تھا، لیکن اسے وہ اس وقت اپنے تصور میں بھی قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ مجید کو یہ جان کر گہرا صدمہ پہنچا تھا کہ خلیق اپنے مصائب میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ وہ اس کی مجید کی تسکین اور دلاسے کا طالب بھی نہیں رہا۔ اسے خلیق کی مایوسی اس کے حقیقی نقصان سے بہت زیادہ محسوس ہوئی۔

مجید کو محسوس ہوا کہ اسے تنہا اور لاچار چھوڑ دیا گیا ہے۔

باب نمبر 21

دوپہر کے وقت مجید خود اپنے کھیت دیکھنے گیا۔ نقصان کا اسے پہلے ہی اندازہ تھا اس لئے تباہی و بربادی کا منظر دیکھ کر وہ زیادہ پریشان نہ ہوا۔ اس نے تھوڑا سا چکر لگایا۔ برباد فصلوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر زیرِ تعمیر مسجد کی طرف چلا گیا۔ گزشتہ مہینے کے دوران کام کی رفتار بہت سست رہی تھی۔ بانس کی مچانوں میں جکڑی ہوئی نیم تعمیر شدہ عمارت کو دیکھ کر اسے اکثر خیال آتا تھا کہ گنبد کی تعمیر ابھی دور کی بات ہے۔ اب وہ اس وہم میں پڑ گیا کہ کیا کبھی وہ اسے دیکھ بھی سکے گا یا نہیں۔ حقیقی عمارت اس سے بہت چھوٹی ثابت ہونی تھی جس کا خیال اس نے اپنے تخیل میں اس وقت بنایا تھا جب خلیق نے پہلے پہل مسجد کی تعمیر کی تجویز پیش کی تھی۔ اتنے چھوٹے سے ڈھانچے پر ایک خوبصورت گنبد کا تصور ذرا مشکل تھا پھر بھی تعمیر مکمل ہونے تک وہ خیالی پلاؤ تو پکا سکتا تھا۔ اور ایسی مسجد کے خواب دیکھ سکتا تھا جو نہ صرف شاندار، خوبصورت اور بلند و بالا تھی بلکہ میلوں کے فاصلے سے اسے دیکھا جا سکتا تھا۔

آج کوئی شخص بھی وہاں کام نہیں کر رہا تھا۔ کئی منٹ تک اس ویران جگہ میں گھومنے کے بعد مجید نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا اچانک تھوڑے سے فاصلے پر کسی ہلتی ہوئی چیز نے اسے متوجہ کر لیا۔ سرخ لنگی پہنے کوئی شخص دریا کی جانب سے اس کی طرف بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ زمین رات کی بھاری بارش کے سبب ابھی تک گیلی تھی اور اس پر صاف شفاف دھوپ چمک رہی تھی۔ بھاگتے ہوئے آدمی کی لنگی بھی چمک رہی تھی۔

حیرت سے مجید اس کا انتظار کرنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کے قریب آنے پر مجید نے پوچھا۔

ہانپتے ہوئے شخص نے ہیجان کے عالم میں دریا کی طرف اشارہ کیا۔

''دریا سنبل سے بھرا ہوا ہے''۔

''آبی سنبل؟''

''ہاں۔ان سے بھرا ہوا ہے''۔

مجید نے تیوری چڑھائی۔ آبی سنبل سے سال بہ سال ندیاں اٹ جاتی ہیں۔لیکن اس دریا میں وہ عموماً دکھائی نہ دیتے تھے۔

''بھئی اس دریا میں ان آبی سٹیلوں کا کیا کام؟'' مجید نے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتہ۔لیکن وہ بھرا ہوا ہے''

''اچھا تو پانی اونچا ہو رہا ہے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔شاید''۔

چند لمحوں کے لئے مجید خیالوں میں گم رہا۔ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ یہ برا شگون ہے۔اس کا مطلب تو یہی ہے کہ عجیب وغریب پانی دریا میں آملے ہیں۔ایک لفظ کہے بغیر وہ گھر کی طرف جانے لگا۔اسے اپنی تھکاوٹ کا علم تھا۔اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔اس نے سوچا گزشتہ رات سے وہ مشکلات میں پھنسا ہوا تھا۔

مجید کا ذہن بار بار آبی سنبل کی طرف جا رہا تھا شاید اس شخص نے محض چند سنبل ہی دیکھے تھے اور باقی کو اس کے تخیل نے تخلیق کر لیا تھا۔اس نے سوچا۔یوں وہ اپنے گھر کے صحن تک پہنچنے پر خود کو دلاسا دے رہا تھا۔

پھر بھی اس کی بے چینی ختم نہ ہوئی۔اسے یوں لگا کہ جیسے دور افق کے پار زیادہ تباہی اور دکھ لانے والی بدی کی قوتوں کی چوری چھپے پیش قدمی شروع ہو چکی ہے۔اب جب کہ وہ آگے بڑھنا شروع ہو چکی ہیں وہ انسانوں کے لئے مصیبت اور آفت لائے بغیر نہ ٹلیں گی۔

کیا خلیق کو بھی ایسی ہی پیش آگاہی تھی؟ کیا اسے آبی سنبل کی خبر دوسروں سے پہلے ہی ہو گئی تھی؟ مجید نے سوچا کہ اسی حوالے سے اس کے عجیب رویے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے دوست کے بارے میں ایک نئی ہمدردی محسوس کرنے لگا۔غیر انسان کی دلجمعی اور اس کا سکون تو پل میں غارت ہو سکتا ہے۔کیا ضروری ہے کہ انسان مصائب کے پورے سلسلے کو برداشت کرے؟ ایک ہی مصیبت آن پڑے تو بہت ہوتی ہے افلاس، بھوک، مہلک وبائیں اور ایک لاحاصل موت۔ یہ وہ خطرے ہیں کہ جو سدا سے چلے

آ رہے ہیں ان کے ہوتے ہوئے کسے اطمینان نصیب ہوسکتا ہے۔

اس شام صحن میں سے گزرتے ہوئے مجید نے پوری طرح کان لگا رکھے تھے۔لیکن اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ چھوٹی سی سیڑھی سے گزرنے کے بعد وہ بند برآمدے میں داخل ہوگیا۔ دروازے کے پاس اسے ایک سایہ دکھائی دیا اور وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ رحیمہ تھی کمرے کے اندر ایک مدھم سی لالٹین جل رہی تھی۔

حواس پر قابو پاتے ہوئے مجید نے اپنی بیوی کو جھڑکا ''یوں کسی بدروح کی طرح وہاں نہ کھڑی ہوا کرو بات کیا ہے؟''

''جمیلہ بہت بیمار ہے''۔

رحیمہ کی طرف سختی سے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا ''ایسے ہی ذرا سا بخار ہوگیا۔ پریشانی کی کیا بات ہے''۔

لیکن اس صبح سے جمیلہ کو واقعی بہت تیز بخار تھا۔ دن بھر وہ بے ہوشی کی کیفیت میں مبتلا رہی تھی۔ سہ پہر کو تھوڑی دیر کے لئے وہ ہذیان کی زد میں بھی آ گئی تھی۔ مجید اس کمرے میں گیا جہاں وہ بے سدھ اور بے ہوش پڑی تھی۔ کچھ کہے بغیر رحیمہ اس کے پیچھے ہولی تھی۔ اس نے بیمار لڑکی کے ماتھے کو چھوا اور پھر فوراً ہی ہاتھ پیچھے کر لیا۔ رحیمہ کانپنے لگی اور خود بخود اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔ مجید دوسرے کمرے میں گیا کپڑے تبدیل کئے اور پھر واپس آ گیا۔ رحیمہ کو دیکھے بغیر اس نے کہا ''اس کا بخار بہت تیز ہے لیکن ٹھیک ہو جائے گی''۔

اچانک رحیمہ اس کی طرف پلٹی اور آنسوؤں سے لبریز تقریباً چیخ کر کہنے لگی ''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

شاید فوراً ہی اسے اپنے سوال کے نامناسب ہونے کا احساس ہوگیا تھا، اس لئے جلدی سے مجید کی نظروں کے سامنے سے ہٹ گئی۔ مجید کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئی تھیں۔ تاہم اس نے ضبط سے کام لیا اور نہانے کے لئے تالاب کی طرف چلا گیا۔ وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ ناراضگی بھی اس کے لئے دشوار ہوگئی تھی۔

بعد ازاں رات کا کھانا کھاتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ اور احتیاط سے مچھلی کے کانٹے چنے اور انہیں تھالی کے ایک کنارے پر رکھ دیا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو رحیمہ اس کا حقہ لے آئی۔ لکڑی کے چھوٹے سے سٹول پر بیٹھ کر وہ حقہ پینے لگا۔

رحیمہ نے برتن اکٹھے کئے اور باہر جا کر احتیاط سے انہیں دھونے لگی کہ کوئی شور پیدا نہ ہو۔ اس کے بعد وہ اندر جا کر جمیلہ کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں دکھ، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔

مجید کو جمیلہ کی بیماری کے سلسلے میں رحیمہ کی تشویش کا دھندلا سا احساس تھا۔ اگرچہ خود اسے اس لڑکی کی کیفیت کے بارے میں کوئی تشویش نہ تھی۔ پھر بھی رحیمہ کی خاطر وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اپنے مخصوص اور عجیب وغریب انداز میں وہ کسی نہ کسی طور اس کا احترام کرتا تھا۔ لیکن دن کے واقعات اس کے ذہن پر اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ وہ ان عورتوں کے معاملے پر توجہ نہ دے سکتا تھا۔ سہ پہر کے وقت بہت سے لوگوں نے دریا میں آبی سنبل کی موجودگی کی تصدیق کر دی تھی۔ اس سے بھی خطرناک بات یہ تھی کہ شام کے قریب اس نے سنا تھا کہ دریا کا پانی تھوڑا سا چڑھ چکا ہے..... یہ خبر واقعی تشویشناک تھی۔ دوسرے کمرے میں لڑکی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دو چار کش لگائے اور کھانسنے لگا۔

''ذرا دھیان رکھنا ہوا اندر نہ جائے اور اگر اسے ٹھنڈ لگ رہی ہو تو ایک اور لحاف دے دو''۔ رحیمہ کے جواب نہ دینے پر اس نے کہا ''میں اسے بعد میں تھوڑا سا پھونکا ہوا پانی دوں گا''۔ اب بھی کوئی جواب نہ آیا تو اس نے اونچی آواز میں پوچھا ''تم کیا کر رہی ہو بی بی؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بس بیٹھی ہوں۔'' مجید نے اچانک تلخی کے ساتھ اس کے الفاظ دہرائے۔ دور سے گرج کی آواز سنائی دی۔ مجید آواز کے ختم ہونے تک اسے غور سے سنتا رہا۔ ایک اور طوفان آ رہا ہے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

جمیلہ کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے رحیمہ نے گرج کی آواز پر کان لگائے لیکن خاموش رہی۔ جمیلہ نے ذرا سی حرکت کی۔ اپنی بخار زدہ آنکھیں کھولیں اور نیم تاریکی میں رحیمہ کو دیکھنے لگی۔

''بہن تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے''؟ رحیمہ نے اس کے اوپر جھکتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

جمیلہ نے اپنے خشک ہونٹ کھولے، ایک بازو کو ہولے سے جھٹکا دیا اور اس کی چوڑیاں کھنکنے لگیں۔

''یہ کیا ہے؟'' مجید نے منہ سے حقے کی نالی ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں کیا چاہتی ہے۔ میں اسے تھوڑا سا پانی دے دوں۔''

پیتل کے کٹورے میں اس نے تھوڑا سا پانی ڈالا اور بیمار لڑکی کا سر ذرا سا اوپر کر کے اسے پلانے لگی۔ لگتا تھا کہ جمیلہ ہوش میں آ رہی ہے اس نے پانی پی لیا۔ لیکن چند ناقابلِ فہم الفاظ بڑبڑانے کے بعد پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔ تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے رحیمہ نے اس کا ہاتھ پر سے لحاف کے اندر کر دیا وہ ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں سوچنے لگی جنہیں وہ جمیلہ کی دوا بنانے کی خاطر کل کھوٹے پیسے گی۔ دن بھر بیمار لڑکی نے کچھ نہ کھایا تھا۔ اور رحیمہ کا خیال تھا کہ مریض کے لئے یہ اچھی بات ہے لیکن کل اسے گاؤں کے بنیادی سے غذائیت بخش سا گودانہ منگوایا ہوگا۔

مغرب کی نماز کے لئے مجید اٹھا۔ رحیمہ بیمار لڑکی کو چھوڑ کر گئی اور بالٹی سے پانی لوٹے میں بھرا اور پھر مجید کے وضو کے لئے اسے دروازے کے پاس رکھ دیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پانی کا پیالہ طلب کیا۔ التجاؤں اور دعاؤں کے بعد زور سے اس نے پھونک ماری اور کہنے لگا ''بی بی اسے یہ پانی دے دو''۔

طوفان کہ ابھی دور تھا یکدم زور زور سے گرجنے لگا اور کافی دیر تک اس کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پیالہ ہاتھ میں لئے رحیمہ گڑگڑاہٹ سنتی رہی اور جب وہ دوسرے کمرے میں داخل ہو رہی تھی تو اسے ٹھوکر لگی اور تھوڑا سا پانی گر گیا۔ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے آگے کی طرف اٹھا ہوا اپنا دایاں پاؤں پیچھے کر لیا تاکہ دم کئے ہوئے پانی کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ خوف و حیرت سے وہ گرے ہوئے پانی کو دیکھنے لگی۔

مجید اس کی طرف آیا اور جب اس نے فرش پر پانی کو دیکھا تو ایک عجیب سا ناقابل فہم خوف اس پر چھا گیا۔ اس پر سے پھلانگ کر وہ دروازے کی طرف لپکا۔ رحیمہ نے اگرچہ اپنا پاؤں پیچھے کر لیا تھا اس کے باوجود وہ چلّایا، ''اس پر پاؤں نہ رکھنا!''

اس نے بڑے خلوص سے دعائیں مانگی تھیں، لیکن جس پانی کو خدا کے نام سے اس نے متبرک بنایا تھا۔ اب وہ فرش پر گر چکا تھا۔ جس پر وہ چلتے تھے۔ صدمے پر قابو پاتے ہوئے رحیمہ نے پیالہ مجید کو تھما دیا جیسے وہ اس مقدس ذمہ داری سے دست بردار ہو رہی ہو جسے پورا کرنے کے وہ خود کو اہل نہیں سمجھتی۔ پھر آہستہ سے کمرے کے دوسرے کونے میں جا کر شوہر کی طرف پیٹھ کر کے وہ کھڑی ہوگئی۔ وہاں یہ مضبوط اور توانا عورت

جس کے کبھی کبھی آنسو تو بہتے تھے لیکن جو کبھی زور سے روئی نہ تھی۔ شدید مایوسی کے عالم میں زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔ لگتا تھا کہ وہ اپنا دکھ خالی دیوار کو بتا رہی ہے اور یہ ہونا ہی تھا کہ رحیمہ جو چیزوں کے معنی جاننا چاہتی تھی اور جسے کوئی مفہوم نہ ملا تھا وہ جو اس شخص کو بھی نہ سمجھ سکی تھی جو اس کا شریک حیات تھا، وہ آخر دیوار کے سوا کس کی طرف رخ کر سکتی تھی۔

پریشانی کے عالم میں مجید نے اس کی طرف دیکھا۔ متبرک پانی فرش میں جذب ہو چکا تھا۔ آسمان طوفان کی گرج اور گڑگڑاہٹ سے گونج رہا تھا اور اس کی پہلی بیوی یوں واویلا کر رہی تھی جیسے اس کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔ ان ساری باتوں میں اسے انتقام اور مکافات اور موت کا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ہاں ایسے ہی لمحے ہوتے ہیں جب بدی کسی کے گھر پر حملہ کرتی ہے۔

وہ بہت ہوا، بی بی، بہت ہوا'' اس نے دل گرفتہ لہجے میں زور سے کہا۔ ''چیخ چیخ کر رونا مجھے بھلا نہیں لگتا۔''

رحیمہ فوراً چپ ہو گئی لیکن اب بھی دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے بت بنی کھڑی تھی۔

''کچھ نہ کچھ کرو!'' مجید چلّایا۔ ''زمین کو وہاں سے کھرچ دو جہاں پانی گرا تھا اور اسے حوض میں ڈال دو''۔

مجید نے درشتی سے سر ہلایا۔

تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گویا خود تاریکی اس گھر پر نازل ہو رہی تھی۔ مجید نے دروازہ بند کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کے ہونٹ خاموش دعاؤں میں مصروف تھے۔ پھر اس نے چراغ کو دونوں کمروں کے بیچ والے دروازے کے پاس رکھا اور جمیلہ کے پہلو میں لیٹ گئی۔

چھت پر بارش کے بڑے بڑے قطرے پڑ رہے تھے اور تیز ہوا گھر سے ٹکرا کر گویا آہ وزاری کر رہی تھی۔

خیر طوفان زیادہ دیر تک جاری نہ رہا۔ جب وہ ختم ہوا تو مجید ابھی پوری طرح جاگ رہا تھا۔ چھجے سے گرنے والا بارش کا پانی رات کی خاموشی کو چیر رہا تھا۔ طوفان کا خاتمہ تسکین کا احساس لے کر آیا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ وہ کس قدر مضطرب ہو گیا تھا اور تشویش کے کس قدر گہرے جذبے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

یہ تو حماقت ہے، نری حماقت، میرا رویہ بھی خلیق جیسا ہی ہو گیا ہے۔ اس نے خود پر ملامت کی۔

اب ذرا سا ستانے پر اسے دوبارہ انسانی رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی اسے رحیمہ کا خیال آیا جو جمیلہ کی بیماری سے پریشان تھی۔ اس نے سوچا کہ ان دونوں کا تو کوئی ایمان ہی نہیں ہے۔ اچھا میں اسے بلا کر دلاسا دیتا ہوں اور اسے سمجھاتا ہوں کہ اگرچہ دنیا دکھوں سے بھری پڑی ہے لیکن انسان کو چاہئے کہ وہ استقلال سے اسے برداشت کرے۔ ژالہ باری کا طوفان کسی پیشگی علامت کے بغیر آیا اور سب کے لئے مصیبت کا باعث بنا ہے لیکن جو کوئی بھی امتحان ہو ہمیں چاہئے کہ اسے برداشت کریں۔ بڑے بڑے سیلاب کبھی آ سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھی گزر جائیں گے بشرطیکہ کہ ہمیں معلوم ہو کہ خدا کی ذات پر ایمان رکھتے ہوئے ہمیں کس طرح ان کا سامنا کرنا ہے۔ اب جمیلہ بیمار ہے لیکن اگر کسی کو یہ پتہ ہو کہ وہ بیمار کیوں ہے تو پھر بیماری کو برداشت کرنا سہل ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ مایوس نہ ہونا چاہئے۔ زندگی کے دکھوں میں جو کوئی حوصلہ دیتا ہے وہ اپنی بزدلی اور اس کے ساتھ ساتھ خدا اور اس کے ابدی رحم میں ایمان کی کمی کی غمازی کرتا ہے۔

لیکن اس نے رحیمہ کو آواز نہ دی۔ اصل میں وہ یہ باتیں کسی عورت کو بتانے کی بجائے اپنے دوست خلیق کو بتانا چاہتا تھا۔ شعوری اور غیر شعوری دونوں حوالوں سے وہ اپنے دوست کی کمزوری پر شدید پریشان ہوا تھا۔ اس سے نہ صرف اسے اپنے تنہا رہ جانے کا خوف دامن گیر ہوا تھا بلکہ ہمت کے اس احساس کو بھی ضعف پہنچا تھا جو وہ اپنے مشن میں محسوس کرتا تھا۔

اس نے سوچا کہ میرا دوست تو بہت کمزور انسان ثابت ہوا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں اس شخص جیسا غصہ سمانے لگا جسے فریب دیا گیا ہو۔ چاہے کچھ بھی ہو میں ہمت نہ ہاروں گا۔ اس نے خود سے وعدہ کیا۔

باب نمبر22

بنگال کے جنوب بعید میں جہاں دھرتی سمندر میں مدغم ہوتی ہے۔ وہاں بڑے بڑے اور گہرے دریا بہتے ہیں۔ یوں کہئے کہ دریا راج کرتے ہیں۔ اس علاقے میں دریا شمالی علاقوں کی طرح اونچے اونچے اور طے شدہ کناروں کے اندر نہیں بہتے۔ کچھ شمالی علاقوں میں تو خشکی کی حکمرانی ہے۔ جنوب کے عظیم اور زور آور دریا کناروں کے قائل نہیں وہ دھرتی اور انسان کی کسی رکاوٹ کو نہیں مانتے۔ خشک موسموں میں ان کے پانیوں کی شوریدہ سری قدرے کم ہو جاتی ہے اور کناروں کے مبہم سے بیچ وخم اجاگر ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسے دن بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ مون سون کی آمد کے ساتھ ہی یہ زور آور ندیاں پھر سے اپنی شکتی اور عظمت حاصل کر لیتی ہیں اور ان کا بیچ وتاب بڑھنے لگتا ہے اور وہ بربادی کے پیامبر فاتح، جنگی سورماؤں کی طرح راہ میں آنے والی زمینوں کو روندتی اپنی فتح کا اعلان کرتی چلی جاتی ہے۔

شمال میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں دریا دھرتی کے حلقہ بگوش ہیں اور کناروں کے درمیان اپنے طے شدہ راستوں پر بہے چلے جاتے ہیں۔ سرما کے دنوں میں پانی تیزی سے کم ہو جاتا ہے اور کنارے اونچے برجوں کی طرح نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہاں وہاں جگہوں پر دریا چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

محبت پور کے گرد و پیش کا علاقہ جنوب اور شمال کے درمیان واقع ہے۔ اور یہاں زمین سمندر کی سطح کے مساوی ڈیلٹا کے علاقے سے قدرے اونچا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہاں برتری کے لئے جدوجہد کا کبھی حتمی فیصلہ نہیں ہوتا۔ جب بالائی

علاقوں میں شدید بارشیں ہوتی ہیں تو یہاں زمین کے اونچے کنارے دریاؤں کو قابو میں رکھنے کی تگ و دو کرتے ہیں لیکن زنجیر کی کمزور کڑیوں کی طرح دریا نرم جگہوں کو توڑ کر بہہ نکلتے ہیں اور یوں رکاوٹوں کو توڑنے کی اپنی جدوجہد میں سرخرو ہو جاتے ہیں۔ من موجی دریا شادمانی کے ساتھ آگے بڑھنے لگتے ہیں۔

دھرتی اور دریا امن کی حالت میں ہوں تو انسان مزے میں رہتے ہیں۔ لیکن جب سیلاب کے دن آتے ہیں تو انہیں بھی جدوجہد میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے وہ دھرتی کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ زمین کے نرم گوشوں کو مضبوط بناتے ہیں کہ بپھرے ہوئے دریا ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ البتہ مصالحت کی خاطر دھان لگانے والے نیچے علاقوں پر حملہ کرنے کا دریاؤں کو موقع دے دیا جاتا ہے۔ پھر یہ علاقے وسیع و عریض لیکن اتھلی جھیلیں بن جاتے ہیں اور کھڑی فصلوں کو نقصان سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔

جہاں انسان رہتے منقنی ہوں۔ ان علاقوں کو تو بچانا ہی پڑتا ہے۔ وہاں اتنے اونچے بند بنائے جاتے ہیں جتنی اونچائی تک دریا کے چڑھنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن سانپ کی طرح متلون مزاج اور منقنی دریا انسان کی بنائی ہوئی رکاوٹوں کو دور کرنے کے در پر رہتے ہیں۔ پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ اپنی راہیں بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ کناروں پر اچانک حملہ کرتے ہیں اور انہیں بے خبری میں جا لیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دریا ان مقامات پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالتے جن کی خوب خبر گیری کی جاتی ہے۔ اس کے بجائے وہ چوری چھپے آگے بڑھ کر ان مقامات پر حملہ کر دیتے ہیں جنہیں انسان ناقابل تسخیر خیال کرتے ہیں۔ چوری چوری وہ گار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے رہتے ہیں اور اس طرح اتھل جگہوں کو گہرا اور گہری جگہوں کو اتھلا بنا دیتے ہیں۔ زمین پر بسنے والے انسان اس چال سے بے خبر رہتے ہیں۔

کبھی کبھی لگتا ہے دریا نے جنگ بندی کر دی ہے اور وہ زمین کے بنائے ہوئے راستے پر امن اور عاجزی سے بہنے لگا ہے۔ اس کا زور بتدریج کم ہونے لگتا ہے جیسے کہ وہ مر رہا ہو۔ لیکن انسان شک و شبے سے اس پر نظریں گاڑے رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ دریا دھوکا دے رہا ہے۔ سال کے بعد سال گزرتے چلے جاتے ہیں اور دریا کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ داؤ نہیں لگائے گا۔ وہ بے پروا ہو جاتے ہیں بلکہ دریا کو بڈھا دریا بھی کہنے لگتے ہیں۔ اگرچہ اس کا بڑھاپا یا اس کی موت خوشی

کا سامان نہیں لاتی۔ مردہ دریا ان کے لئے اور ان کے کھیتوں کے لئے یکساں نقصان دہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی جوانی اور اپنی شکتی کھو دیتا ہے۔ ستم گر اور کٹھور دریا مردہ دریا سے تو بہرحال زیادہ تسکین دہ ہوتا ہے۔

محبت پور کا دریا دھمرا مٹی گنج سے پانچ میل اوپر کی طرف سے دھانوتی دریا سے الگ ہو کر یوں پیچ وخم کھاتے ہوئے بہتا ہے کہ اگرچہ اس کا نمایاں بہاؤ شمال مغرب کی طرف رہتا ہے لیکن اس کے رخ کا تعین کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ خیر اس پیچ وخم کے باوجود دھمرا کو نرم خو سمجھا جاتا ہے۔ ایک مقام پر وہ تیزی سے شمال کی طرف مڑتا ہے۔ یہاں وہ مجید کے گھر سے ایک میل دور دھان کے کھیتوں کے قریب بہتا ہے۔ کئی برس پہلے وہ مرنا شروع ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ اس پر موت کی کپکپی طاری ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا بہاؤ مزید کمزور ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ گاؤں والے اسے ''مردہ دھمرا'' کے نام سے پکارنے لگے۔

پھر چند سال کی بات ہے کہ اس کا شباب واپس آنے لگا اور اس کی سطح کی ریت پر پانی کی لہریں موجزن ہوگئی۔ اس کے بہاؤ میں وہی رفتار اور وہی تیزی پیدا ہوگئی جو پہلے کبھی تھی۔ اور جس کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ اب وہ واپس نہ آئے گی۔ اب وہ کسی طور مردہ دریا نہ رہا تھا۔ لیکن اس کے طعف کے دنوں کا نام باقی رہا اور سب لوگ اسے مردہ دھمرا ہی پکارتے رہے۔

حالیہ برسوں کے دوران برسات کے موسم میں کسی اچھی طرح سدھائے ہوئے جانور کی طرح فرمان بردار دھمرا صرف انہی علاقوں میں سیلاب برپا کرتا جہاں اس کا پانی انسانوں کے لئے مفید ہوتا۔ دائیں بائیں صرف اسی جگہ اس کا پانی داخل ہوتا۔ جہاں اس کی ضرورت ہوتی۔ یوں ہر سال گاؤں سے اوپر کی طرف کچھ فاصلے پر وہ خاموشی سے ایسے کھیتوں میں پانی داخل کر دیتا جہاں کسان چاول کی فصل لگاتے اور مچھلیاں پکڑتے تھے۔

یہ گاؤں نسبتاً اونچی سطح پر آباد تھا جب کہ مزار نیچی اور چینی سطح پر واقع تھا۔ تاہم مزار کے قریب ترین کنارا غیر معمولی طور پر بلند تھا اور یہیں سے دریا گاؤں کے گرد چکر لگانے کے لئے تیزی سے موڑ کھاتا تھا۔ دریا اس اونچے کنارے سے کسی قدر قوت کے ساتھ ٹکراتا لیکن اس کا تباہی مچانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ہاں اگر دریا کبھی مستی میں آجائے تو پھر وہ پے در پے مزار اور مجید کے گھر کو غرق کر سکتا ہے۔ باقی زیادہ تباہی نہیں مچا

سکتا۔اس لئے یہاں یہی دو عمارتیں ہیں۔باقی یہاں آبادی نہیں ہے۔

آبی سنبل دکھائے دینے کے چالیس گھنٹے بعد نرم خوا اور متین دھمرا غصے سے پھنکار رہا تھا۔نچلے کناروں سے اس کا پانی بہہ کر گاؤں کے گرد و پیش کے کھیتوں میں پھیل گیا تھا یوں ایک وسیع و عریض جھیل وجود میں آ گئی تھی۔بلند تر سطح پر آباد گاؤں بتدریج ایک جزیرہ بن کر رہ گیا۔

سیلاب دن رات امنڈتا رہا۔لحہ لحہ امڈا اور جتنا علاقہ اس کی زد میں آتا گیا اس پر پھیلتا چلا گیا۔ژالہ باری کے طوفان کے ہاتھوں جو تھوڑی بہت فصلیں تباہ ہونے سے محفوظ رہ گئی تھیں، اب وہ سیلاب کی لپیٹ میں آ گئیں۔پانی کی نرم چادر کھیتوں پر چھاتی چلی گئی۔مجید کے گھر سے گاؤں کی طرف جانے والا چھوٹا سا راستہ جس پر بانسوں کا ایک جھنڈ کھڑا اور چند مختلف قسم کے درخت اور آخر میں بڑ کا اونچا اکیلا درخت جو شان و شوکت سے کھڑا تھا۔ابھی تک سیلاب کے پانی کی سطح سے اونچا تھا۔لیکن پانی کی زبان نے اس کے ایک پہلو کو چاٹنا شروع کر دیا تھا۔شمال سے سیلاب مجید کے گھر کا رخ کر رہا تھا۔مزار اور نیم تعمیر شدہ مسجد بھی اس کی زد میں تھی۔لیکن اس کی خفیہ پیش قدمی کو اس چھوٹے سے جنگل نے چھپا رکھا تھا جو چوتھائی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگر دور شمال کی طرف سے پانی کے ریلے اسی طرح آتے رہے جو نہ تو اس دریا کا حصہ ہیں، اور نہ جنہیں دریا سنبھال سکتا ہے تو پھر گاؤں اس کی زد میں آئے ہی آئے۔پس پھر پانی اس میں اس طرح راہ بنائے گا کہ اس کی شکل کھن کھجورے کی بن جائے گی۔پھر یہ ضروری ٹھہرے گا کہ نواح میں واقع گھروں کو خیر باد کہا جائے اور ان کے مکین اپنے ڈھور ڈنگر سمیت گاؤں کے مرکز میں سب سے اونچے مقام کی طرف منتقل ہو جائیں۔لیکن مجید کے گھر اور مزار کو بچانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

باب نمبر 23

اس شام جب آخری شخص بھی مزار سے چلا گیا تو مجید صفائی کی خاطر وہیں رہا۔ پھر اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ بالآخر جانے کا ارادہ کرتے ہوئے اس نے چراغ بجھایا اور ایک لمحے کے لئے رک کر جلنے والی اگربتی کی میٹھی اور بھاری خوشبو میں ایک گہرا سانس لیا۔ پھر اس نے مزار کے سرہانے جلنے والی موم بتیوں کی مدہم روشنی میں گرد و پیش کا مبہم سا جائزہ لیا۔

اس شام صرف آدھی درجن کے قریب لوگ مزار پر حاضری دینے آئے تھے۔ اور شاید وہ حاضری دینے والے آخری افراد تھے۔ انہوں نے بہت کم باتیں کی تھیں۔ زیادہ تر وہ اپنے سر نہیوڑائے خاموش اور بے حس و حرکت اپنے رنجیدہ خیالوں میں گم بیٹھے رہے تھے۔ اگر انہیں قبر میں لیٹی ہوئی روح سے اس بات کی کوئی شکایت بھی تھی کہ اس نے سیلاب کی تباہ کاری کے خلاف ان کی حفاظت نہ کی تو بھی انہوں نے زبان بند رکھی۔ اب وہ سیلاب کے پانی سے بچنے کی خاطر طویل راستہ اختیار کر کے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔

مجید نے اب پانی کی طرف قدم اٹھائے جس میں چاند کا عکس جھلک رہا تھا۔ اس کا لمبا سفید کُرتا ہوا کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ جب وہ پانی کے کنارے تک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سہ پہر کو اس نے جس قریبی درخت کا ٹھنٹھ دیکھا تھا وہ اب غائب ہو چکا ہے۔ اسے کوئی حیرت کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس نے یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ اسے معلوم تھا کہ سیلاب بڑھتا چلا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے گھر، مزار اور نامکمل مسجد کے پار جا کر اپنی منزل تک پہنچ کر ہی دم لے گا۔ سیلاب کا پانی اترنے کے

بعد ان سب کا باقی کیا بچے گا؟ پانی کس قدر اونچا اٹھے گا؟ کب تک پانی رہے گا؟ اس کے ذہن نے ان سوالات پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت بس اسے ایک ہی بات کا یقین تھا اور وہ یہ کہ سیلاب کی سرکش موجیں مزار کی بے حرمتی کرنے سے ہچکچائیں گی نہیں۔ کیونکہ جیسے کہ صرف اسی کو پتہ تھا وہاں کوئی بزرگ دفن نہ تھا بلکہ کوئی نامعلوم شخص وہاں خوابیدہ تھا کوئی سبب نہ تھا کہ پانی وہاں آ کر ٹھہر جاتا۔

خود کو درپیش آنے والے مسائل پر مجید کی گرفت عموماً واضح ہوا کرتی تھی اور وہ ان مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں حل کیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ اپنے آپ سے بہت سے ایسے سوال پوچھ رہا تھا جن کا اسے کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ کیا مجھے سزا دی جا رہی ہے؟ دنیا کے گرد و غبار سے پاک وسیع آسمان پر آب و تاب سے چمکنے والے چاند کے نیچے بلند ہونے والے پانی کے روبرو کھڑے ہو کر مجید نے خود سے سوال کیا۔ اس پاک صاف ماحول میں مجید کو یوں محسوس ہوا کہ وہ میلا میلا اس شخص کی طرح جس کے بدن پر بڑھاپے سے جھریاں پڑ گئی ہوں۔ اور جلد میلی ہو گئی ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا میں نے معصوم لوگوں کو اس پر امادہ نہیں کیا کہ وہ ایک نامعلوم شخص کی روح کے آگے دعا مانگیں۔ ایسا شخص جو گناہ گار بھی ہو سکتا ہے؟ مانا کہ میرا مقصد نیک تھا؟ یقیناً اب مجھے اس بات کی سزا دی جا رہی ہے۔

اس کے دفاع میں یہ سوال اٹھے ضرور مگر وہ دل سے قائل نہیں ہوا اس کے سوال بے جواب ہی رہے۔

سہ پہر کو خلیق نے اسے پیغام بھیجا تھا کہ وہ تحفظ کی خاطر اپنے اہل خانہ کے ہمراہ گاؤں میں اس کے گھر آ جائے۔ مجید کو یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ خلیق اپنے ہی المیے میں ڈوب کر نہیں رہ گیا تھا اور یہ کہ اپنے دوست کی خاطر سوچنے کے لیے اب بھی اس کے پاس وقت ہے۔ لیکن مجید اپنا گھر چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ ''نہیں!'' اس نے خلیق کا پیغام لانے والے لڑکے کو جواب دیا تھا، جاؤ اور میرے اچھے دوست اور نیک دل زمیندار سے کہو کہ میں اور میرا خاندان یہیں رہے گا۔ کیونکہ ہم لوگ مزار کو نہیں چھوڑ سکتے''۔ یہ سن کر لڑکا تیزی سے واپس بھاگ گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سیلاب کے قابو میں نہ آ جائے۔

میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ اس نے خود سے یہ بات دہرائی۔ ہاں شدید ترین مصیبت کے وقت بھی انسان کو اپنا فرض نبا ہنا چاہئے۔ چاہے اس کی جان پر ہی بن آئے۔

لیکن جب اسے خیال آیا کہ اس نے خود ہی یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا اسے اس کے گناہ آلود جھوٹ کی سزا مل رہی ہے تو پھر فرض کی ادائیگی کے کیا معنی۔ یہ ایک تقاضا تھا جس نے اسے گڑگڑا دیا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے اس کا ذہن خلا میں بھٹکنے لگا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے پھر سوچنا شروع کیا۔

میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ یہ میرا گھر ہے جو میری اپنی محنت سے بنا ہے۔ مانا کہ میں اجنبی کے طور پر ملک کے اس حصے میں آیا تھا لیکن اب یہ علاقہ میرا وطن بن چکا ہے۔ یہ گھر اور اس کی لہریا ٹین کی خوبصورت چھت جو دھوپ میں چمکتی ہے۔ یہ وسیع صحن جس کے چاروں طرف نفاست سے کاٹے ہوئے بانسوں کی دیوار، یہ خوشگوار، تالاب جس میں کئی قسم کی مچھلیاں ہیں اور بانس کا پردہ ہے اور جس میں، میں اور میرے گھر والے خلوت میں نہاتے ہیں۔ یہ بہت سے درخت اور ان کے مزیدار پھل۔ مزار اور اس کی شاندار سجاوٹیں جہاں میں نے گھنٹوں بیٹھ کر عبادت کی ہے۔ غور و فکر کیا ہے۔ یہ سب کچھ میرا ہے۔ مدتوں میں مارا مارا پھرتا رہا ہوں، گھر اور سکون اور خوشی کو ترستا رہا ہوں۔ یہاں مجھے یہ سب کچھ ملا ہے، اب اگر یہ سب کچھ غرق بھی ہو جائے تو بھی اس جگہ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ کسی اور جگہ میرے لئے کیا رکھا ہے؟

ایک پل کے لئے سوچنا بند کر کے وہ ستانے لگا اور پھر پکار اٹھا:

''اس کے علاوہ یہ کہ میں خطرے سے ڈر کر بھاگوں گا نہیں'' لفظ خطرہ کے ساتھ یوں لگا جیسے اس کا پارہ چڑھ گیا ہو۔ جونہی اس نے دور فاصلے پر پانی کی چادر کے آر پار دیکھا جو ایک معصوم سی مسرت کے ساتھ جھل مل جھل مل کر رہی تھی۔ تو اس نے طنزیہ لہجے میں دہرایا، خطرہ!'' پھر اسی لہجے میں کہنے لگا ''میں خطرے سے خوف زدہ نہیں ہوں اور اگر وہ میری خوشیوں کی بنیاد پر بھی حملہ کرے تو بھی مجھے اس سے کیوں دور بھاگنا چاہئے؟ پھر میرے لیے ڈرنے کے لئے کیا رہ جائے گا؟''

جب وہ خود کلامی میں مصروف تھا۔ تو اس کے نتھنے کانپ رہے تھے اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ اس کا غرور بھرا طیش سیلاب کے ان پانیوں کو چیلنج کرنے کے در پے ہے۔ جو آہستہ آہستہ مگر بے رحمی سے اس کے گھر اور اس کی مسرتوں کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ تاہم بتدریج اس کا غصہ ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ایک تھکن نے لے لی۔ جس نے اس کے جذبات میں اعتدال پیدا کر دیا تھا۔

اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنا شروع کیا۔ چاہے میں جو کچھ بھی کروں، اس جہاں کا اور اس ساری تخلیق کا مالک تو ہمیشہ ہی رہے گا اور چاہے میں جو کچھ بھی کروں میرا اٹل ایمان تو بھی میرا رہے گا اور اگر ضرورت کے وقت یہ میرا ساتھ نہیں دیتے تو بھی خدا کی لامحدود رحمت تو ہے۔ اگر اس کا سہارا بھی نہ ملے تو پھر میرے لئے کچھ باقی نہ بچے گا۔ ہاں کچھ بھی نہیں کہ پھر سب کچھ غرق بھی ہو جائے اور میرے سارے خواب اور ساری امیدوں پر پانی بھی پھر جائے تو کیا فرق پڑے گا؟

لیکن میرے پاس ایمان کی دولت تو ہے اور اس کی رحمت بے پایاں ہے۔ اس لیئے مجھے ہمت سے کام لینا چاہئے۔ اس نے خود کو یقین دلایا اس لئے میں خوف کو خود پر غالب نہ آنے دوں گا۔

اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے منظر پر نگاہ ڈالی جوش خنک چاندنی میں اس قدر مہربان اور تسکین بخش دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے ہونٹ ہلائے بغیر منہ میں تلاوت شروع کر دی کہ جب آسمان پھٹے گا اور ستارے منتشر ہو جائیں گے! جب سمندر الٹے ہو جائیں گے اور قبریں اوندھی ہو جائیں گے! تب ہر روح کو پتہ چلے گا کہ اس نے کیا کیا ہے اور کیا کچھ کرنے میں وہ ناکام رہی ہے۔ اے انسان کس بدی نے تجھے اپنے رحیم و کریم مالک سے بے خبر کر دیا ہے۔

بالآخر مجید کا سانس درست ہو چکا تھا اور اس کی بے چینی کم ہونے لگی تھی۔ اگر زندگی کی سختیوں نے بہت عرصہ پہلے اس کی آنکھیں خشک نہ کر دی ہوتیں تو شاید اس وقت وہ آنسو بھی بہا لیتا۔

آنکھیں خشک رہیں لیکن پاؤں کے نیچے زمین گیلی ہو چکی تھی۔ پانی قریب تر آ رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹا اور دفعتاً اسے ایک کراہٹ کا احساس ہوا جیسے بے شمار گندے کیڑے اس کے قدموں کے پاس کلبلا رہے ہوں۔

وہ پلٹ کر گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پر موت کی سی خاموشی چھائی تھی۔ چاند کی روشنی میں صحن دودھیا اور ویران دکھائی دے رہا تھا لیکن جونہی اس نے دہلیز پار کی کسی کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز اسے سنائی دی۔ جیسے کوئی چھوٹا سا جانور اس در سے کہ شور پیدا نہ ہو آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ اچانک وہ رک کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے کمرے کی تاریکی سے آنے والی اس عجیب

سی آواز کو سننے لگا۔ اچھا اگر اس سے تسکین پہنچ رہی ہے تو پھر اس کے لئے رونا اچھا ہی ہے۔ اس نے سوچا۔ کبھی کبھی انسان کو رونا بھی تو چاہئے۔

اندھیرے میں بے ہوش جمیلہ کے پہلو میں بیٹھی رحیمہ اس لئے پریشان اور خوف زدہ ہوگئی تھی کہ اگرچہ مزار سے لوگ کافی دیر پہلے جا چکے تھے۔ لیکن اس کا شوہر ابھی تک واپس نہ آیا تھا۔ جب اس نے مجید کے قدموں کی چاپ سنی تو ضبط نہ کر سکی۔ لیکن پھر اس نے جلد ہی رونا بند کر دیا۔ پہلے تو اس نے ساڑھی کے پلو کو کاٹا، اور جب یہ کافی ثابت نہ ہوا تو پھر اپنے ہونٹوں کو سختی سے کاٹنے لگی۔ آخر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

چھوٹا سا چراغ ہاتھ میں لئے مجید دروازے میں نمودار ہوا۔ اس نے نہ تو جمیلہ کی طرف دیکھا اور نہ ہی اس کا حال پوچھا۔ اس کے بجائے مخالف سمت کی دیوار پر نظریں گاڑے اس نے نرمی سے پوچھا ''کیا تم پسند کروگی کہ میں تمہیں گاؤں لے جاؤں؟''

فوری طور پر رحیمہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔ جسے قابو میں رکھنے کی وہ لاحاصل کوشش کر رہی تھی۔

''کیوں؟ پانی کیا اب بھی بلند ہو رہا ہے؟''

ایک لمحے کے لئے رحیمہ سوچنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ مجید نے گھر نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ وہ اسے اس کیفیت میں چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے کہ گھر کے چاروں طرف پانی ہو اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو۔ شام کو جب جمیلہ کی ماں آئی تھی تو اس نے اس سے کہا تھا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس گھر کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ جس کی حفاظت بزرگ کر رہا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ سب اسے چھوڑ جائیں اور اس کے چاروں جانب پانی آ جائے۔ ہاں بیمار لڑکی کی وجہ سے اس امکان نے اسے پریشان کیا تھا۔ تاہم اس نے خود کو تسلی دی کہ گاؤں کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لیے کشتیاں تو دستیاب ہوں گی۔ ویسے بھی کسی مریض کے لیے مزار کی قربت سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟

''ہم کیوں جائیں؟'' اس نے سوال کیا۔

اس سوال نے کسی نہ کسی طور پر مجید کو دلاسا دیا۔ اب جب کہ وہ گھر واپس آ چکا تھا۔ اور اس کے خشک اور چاندنی میں نہائے ہوئے صحن کو دیکھ چکا تھا اسے یہ امکان بعید از

قیاس دکھائی دینے لگا کہ یہ سب کچھ پانی میں غرق ہوسکتا ہے۔

علاوہ ازیں اس نے خود سے اصرار کیا کہ جو کچھ بھی ہو مجھے تو یہیں رہنا ہے۔ تو پھر یہ کیوں نہ رہیں؟

جانے کا سوال اس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اس کا گھر عام گھروں جیسا تو نہ تھا ''جہاں رہتے ہیں۔ یہ تو مزار کا حصہ تھا اور وہ اس کا محافظ تھا۔ اگر وہ مزار سے چلا جائے تو پھر اسے یہ اعزاز حاصل نہ رہے گا۔ ویسے ہی جیسے جو کپتان خطرے کے وقت جہاز کو چھوڑ دے وہ اس کا کپتان نہیں رہتا۔ اگر وہ اس وقت چلا جائے تو پھر لوگوں کا کھویا ہوا یقین واپس لانا دشوار ہے۔

مجید نے دروازے سے چاندنی میں نہائے ہوئے صحن کی طرف جھانکا اور پھر اپنی لکڑی کی کھڑاویں کھٹ کھٹ کرتا واپس آ گیا۔ پھر اس نے کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی، اور گھر میں اس کی شیریں لیکن افسردہ آواز گردش کرنے لگی۔ آواز کے زیر و بم دور تک پھیلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ بلند ہو کر بھی یہ آواز اونچی گونجدار نہ تھی کہ اس میں فاصلے اور دوسری کی کیفیت اب موجود تھی۔ رحیمہ نے یہ آواز سنی تو اسے لگا کہ گویا ہر شے معمول پر آ رہی ہو۔ پریشانی کا کوئی سبب، کوئی بیماری، کوئی سیلاب باقی نہ رہا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا تھا۔ خوشی کے آنسوؤں کا سیلاب، اس خوشی کا جو اس کے سینے میں امنڈی ہوئی تھی۔

باب نمبر 24

رات طویل تھی۔

کلام پاک کی ایک طویل سورت کی تلاوت کے بعد، جسے مجید نے کئی بار دہرایا تھا، وہ دن بھر مشقت کرنے والے مزدور کی طرح تکان محسوس کر رہا تھا۔ کچھ کھائے پیے بغیر وہ بستر پر دراز ہو گیا لیکن پو پھٹنے سے کافی وقت پہلے ایک عجب سے شور نے اسے جھنجھوڑ ڈالا اور وہ جاگ اٹھا۔ بیٹھ کر وہ توجہ سے شور کو سننے لگا۔ مٹی کے بڑے بڑے ٹکڑے کنارے سے ٹوٹ کر گرجدار آواز پیدا کرتے ہوئے غضبناک دریا میں یکے بعد دیگرے گر رہے تھے۔

یہ ٹوٹ پھوٹ اس کے گھر سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر اس جگہ ہو رہی تھی جہاں دھمرا دریا تیزی سے رخ بدلتا ہے۔ اس دوری کے باوجود مٹی کے تودوں کے گرنے کی آواز میں خوفناک انداز میں آواز سنائی دے رہی تھی۔ پانی میں غرق کھیتوں پر سے پھسلتی ہوئی آ رہی تھی اور ہر آواز اونچی سے اونچی آواز دھیمی سے دھیمی صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔

مجید نے سوچا کہ بہ ضرور اونچا کنارا ہوگا۔

گاؤں کے گرد و پیش کے کھیتوں میں آنے والا سیلاب کا پانی، جو اب مجید کے گھر تک تقریباً پہنچ چکا تھا، اوپر کی طرف نچلے شگاف سے بہہ کر آیا تھا۔ اس لیے اس کی رفتار بھی دھیمی رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اب اونچا کنارا ہی سارا بہہ جائے تو پھر دونوں طرف سے یہ پورا علاقہ فوراً ہی زیر آب آ جائے گا۔

اس نے چھوٹا سا چراغ جلایا اور حقہ تیار کیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے ہاتھ

ہولے ہولے کانپ رہے ہیں۔فوری طور پر اس کے ہاں ایک تلخی پیدا ہوئی اور وہ بڑبڑایا ''کانپنے دو ان کم بختوں کو۔کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کے ہاتھ کبھی نہیں کانپے؟''

لکڑی کے چھوٹے سے سٹول پر بیٹھ کر تمباکو کا مزہ لیے بغیر وہ جلدی جلدی حقہ گڑگڑانے لگا۔اس کے کان اب بھی شمال کی جانب لگے تھے۔پھر حقے کو پرے کرتے ہوئے وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔تکیے کے نیچے تسبیح پڑی تھی۔اس نے تسبیح نکالی اور اس کی پھرتیلی انگلیاں چھوٹے چھوٹے کالے دانتوں پر حرکت کرنے لگیں۔

دریا کے ٹوٹتے ہوئے کنارے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔مجید کو احساس تھا پر اب یہ امید کم ہے کہ اس کا گھر اور مزار پانی کی زد میں آنے سے بچ جائے گا۔

انگلیاں تیزی سے تسبیح پر حرکت کر رہی تھیں اور اتنی ہی تیزی سے خیالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔کبھی اسے یہ سوچ کر غصہ آتا کہ وہ پھنس گیا ہے اور بالکل بے بس ہے، اور کبھی خوف سے اس کا خون خشک ہو جاتا۔اس خوف سے کہ آفت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔مستقبل ایک خلا کی صورت اسے گھور رہا تھا۔

کسی شخص کے لیے یہ جاننا دشوار ہے کہ آیا اس نے گناہ کیا ہے اور کس حد تک وہ گنہگار ہے۔مجید نے خود سے کہا۔لیکن میں یہ بات ضرور جانتا ہوں کہ میں اپنے گناہوں کی وجہ سے خوف زدہ نہیں ہوں۔مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ جن حالات سے نکل کر میں یہاں تک پہنچا تھا پھر واپس اسی صورت حال میں نہ پہنچ جاؤں۔

اپنے مفلوک الحال آغاز کے تصور کے ساتھ ہی مجید غصے سے پاگل ہو گیا۔اسے ہر طرف بے انصافی نظر آنے لگی۔

اس نے خود سے کہا کہ میں ایمان دار شخص ہوں.....میرا ایمان پختہ ہے۔میں ایسا شخص ہوں جو کبھی اپنے راستے سے نہیں ہٹا۔کیا اس کا کوئی اجر نہیں؟

لیکن جلد ہی وہ پھر سے پرسکون ہو گیا اور کسی جوش و خروش کے بغیر خود سے کہنے لگا:

آخر ہوں تو میں ایک بے خبر بندہ۔مجھے کون سی عظیم صداقتوں کا علم ہے؟ ڈر کا ایک لمحہ آیا تھا۔لیکن اب وہ گزر گیا ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔اس کا چہرہ اداس اور درشت تھا۔دروازے پر جا کر اس نے پکارا ''اٹھو بی بی۔میں تم دونوں کو گاؤں لے جا رہا ہوں''۔

ایک پتلے لیکن خوبصورت حاشیہ دار لحاف میں لپٹی جمیلہ کو اٹھائے اور رحیمہ کو

ساتھ لیے جب مجید نے گھر سے قدم باہر نکالا تو چمکتی چاندنی نے ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ آسمان بالکل صاف اور شفاف تھا۔

بانس کی دیوار میں بنے ہوئے راستے سے گزرتے ہوئے اس نے مزار کی طرف دیکھا۔ پانی وہاں تک تقریباً پہنچ ہی چکا تھا۔

گاؤں کی طرف جانے والا راستہ بہت پہلے ہی زیر آب آ چکا تھا۔ بانسوں کا جھنڈ رنگ رنگ کے درخت اور شاندار بڑ کا درخت آبی سنبل کے تیرنے والے بڑے بڑے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد مجید نے مشرق کی جانب بڑھنے کا ارادہ کیا۔

وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ اپنی عمر اور لڑکی کے بوجھ کے باوجود مجید تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا۔

جلد ہی وہ ٹخنوں تک پانی میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن اس نے اپنی رفتار کم نہ ہونے دی۔ البتہ اس کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ ان کے قدموں سے پیدا ہونے والی آواز میں دریا کے ٹوٹتے ہوئے کنارے کی آواز دبی جا رہی ہے۔ وہ اسے سنتے رہنا چاہتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ اگر یہ آواز بند ہوگئی تو پھر شاید اس کے لوٹنے کے لئے وقت نہ رہے۔ اس نے اپنی رفتار پہلے سے بھی تیز کر دی۔

رحیمہ اور جمیلہ کو گاؤں میں چھوڑ کر اکیلے اپنے گھر واپس آنے کا اس نے جو فیصلہ کیا تھا اس میں نہ تو بہادری کا کوئی احساس شامل تھا۔ اور نہ ہی غصے یا ضد کا کوئی عنصر وہ کسی قسم کا کوئی جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ نہ کسی دلبرانہ کارنامے کا کوئی احساس تھا۔ صرف چند گھنٹے پہلے اس نے اس بات کے مناسب جواز تلاش کر لئے تھے کہ کیوں اسے سیلاب آنے کی صورت میں بھی گھر ہی میں رہنا چاہئے۔ یہ اس کا گھر تھا۔ جو اس نے برسوں کی جان توڑ محنت، بھوک اور مایوسی کے بعد حاصل کیا تھا۔ وہ مزار کا محافظ تھا۔ اور وہ خود ہی مزار کو چھوڑ دیتا تو پھر وہ لوگوں کے اعتماد سے محروم ہو جاتا۔ پھر اس میں اس قسم کے آدمی کا غصہ بھی تھا جو کہتا ہے کہ اس سے زیادتی کی گئی ہے، فریب دیا گیا ہے اور جو انتقام کی خوفناک آگ میں جلتا ہے چاہے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے اسے جان ہی دینی پڑے۔

خیر اب اسے یاد بھی نہ رہا تھا کہ کیوں اس نے گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گھر

جس کا زیر آب آنا یقینی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فیصلہ کر لینے کے بعد مناسب سبب کی موجودگی اس کے لئے اہم ہی نہ رہی تھی۔

مبہم طور پر اس نے ان دشواریوں اور خطرات کی پیش بینی کی جو سیلاب زدہ گھر میں تنہا رہنے کے دوران اسے پیش آ سکتے تھے۔ لیکن وہاں رہنے کی ضرورت ان خطرات اور مشکلات سے کہیں زیادہ شدید تھی۔

جلد ہی مجید اور رحیمہ زیادہ گہرے پانی تک پہنچ گئے۔ رحیمہ اب ڈرنے لگی تھی اور اس نے ہلکی سی چیخ بھی ماری۔ لیکن اس کے شوہر نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ وہ رکنا چاہتا ہے، رانوں تک اس کی ساڑھی پانی میں بھیگ چکی تھی اور اسے چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ جب مجید کو احساس ہوا کہ وہ پیچھے رہ گئی ہے تو منہ سے کچھ کہے بغیر وہ ایک پل کے لئے رک گیا تا کہ وہ ساتھ آ ملے۔

پانی اب دوبارہ ٹخنوں تک آ گیا تھا۔ لیکن اب سنگریزوں کی بھرمار تھی۔ مجید کے ایک پاؤں میں زخم آ گیا تھا، لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی۔

جمیلہ کو اس خیال سے کہ گر نہ جائے اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ لیکن اس کی گرفت میں محبت کی کوئی گرم جوشی شامل نہ تھی۔ وہ تو شاید یہ بات بھول بھی گیا تھا کہ وہ اس کے بازوؤں میں ہے۔

رحیمہ نے مجید کا یہ اٹل بیان صاف طور پر سنا تھا کہ وہ انہیں گاؤں لے جا رہا ہے اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اکیلا گھر واپس چلا جائے گا۔ رات کے اس عجیب و غریب اور ناقابل فہم سفر کے دوران اپنے خوفناک حد تک خاموش شوہر کے پیچھے پیچھے بے ڈھنگے پن سے قدم اٹھاتے ہوئے اور اس کا ساتھ دینے کی بدحواس کوشش میں وہ اس بارے میں بالکل نہیں سوچ رہی تھی۔

مجید کے ہانپنے کی، اونچی دل گرفتہ اور کم وبیش حیوانی آواز میں پانی کے چھینٹوں اور رحیمہ کی ٹانگوں سے پانی سے بوجھل ساڑھی کے ٹکرانے کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ ایک بار رات کا ایک پرندہ ان کے سروں کے اوپر بہت قریب آ گیا اور پھر تیزی سے چکر کاٹ کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ پرندہ انہیں دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کو اس کا پتہ بھی نہ چلا تھا۔ خلیق کے گھر پہنچنے پر مجید نے کئی بار اپنے دوست کو آواز دی اور جب وہ باہر آیا تو مجید نے محض اتنا کہا ''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گھر والوں کو پناہ دے دو''۔

خلیق نے کچھ کہے بغیر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بار بار سر ہلایا اور اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ اداس دکھائی دینے لگا۔ مجید کی درخواست کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ سیلاب کی صورت حال بدتر ہوگئی ہے۔

خلیق نے اپنی بیوی تانو کو بھیجا تاکہ بیمار لڑکی کو اندر لانے میں رحیمہ کی مدد کرے۔ رحیمہ سکوں سے اس کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ آخر تانو آئی۔ اس طرح کہ اس نے مردوں کی طرف سے منہ پھیر رکھا تھا۔ جب رحیمہ اندر گئی تو اسے اپنے دل میں ایک عجیب سا درد محسوس ہوا، لیکن اس نے ایک بار بھی اپنے شوہر کی طرف نہ دیکھا۔ اس کے برخلاف وہ بیمار لڑکی کی طرف متوجہ تھی۔ جسے اندر لے جانے میں وہ مدد دے رہی تھی۔

''اب مجھے جانا ہے'' جب عورتیں اندر چلی گئیں تو مجید نے کہا۔ خلیق کی آنکھوں میں حیرت کی ایک لہر پیدا ہوئی اور وہ دوبارہ بار بار اپنا سر ہلانے لگا۔

جب مجید باہر آیا تو اس نے آسمان میں مشرق کی طرف پو پھٹتے دیکھی۔ چاند اب بالکل زرد ہوکر افق میں چھپ رہا تھا۔ دور تک پھیلا ہوا پانی دھند جیسا دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے رک کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ ایک دبلا پتلا مریل سا آدمی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہر قسم کی کیفیت سے عاری۔ چھدری ڈاڑھی صبح کی سفیدی کی مانند بھدی سفیدی لئے ہوئے، دھبے کی مثال ایک حقیر انسانی وجود طول وعرض میں امنڈتے پھیلتے پانی کے کنارے اکیلا کھڑا ہوا، اس پانی کے کنارے جو پھیلتے پھیلتے دور جا کر آسمان کی بے پایاں وسعت میں مدغم ہوتا نظر آرہا تھا۔

لیکن وہاں وہ مشکل سے پل بھر کے لئے رکا۔ پھر مجید کے لئے اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا، اسے واپس جو جانا تھا۔ اس نے مضبوطی کے ساتھ قدم اٹھایا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرنا تیز تیز چلنا اپنی راہ پر ہولیا۔

ooo